اُسوۂ حسینی

حضرت علامہ سید علی نقی نقوی اعلی اللہ مقامہ

مصباح الہدیٰ پبلیکیشنز

اُسوۂ حسینیؑ

از افادات

حضرت علاّمہ الحاج سیّد علی نقی النّقوی اعلی اللہ مقامہ

ناشر

مصباحُ الہُدیٰ پبلیکیشنز

۱۰۔ گنگارام بلڈنگ۔ شاہراہِ قائدِ اعظم۔ لاہور

نام کتاب : ——— اُسوۂ حسینی

مؤلف : ——— علامہ سید علی نقی نقوی

ناشر : ——— مصباح الہدیٰ پبلیکیشنز ۔ لاہور

زیرِ اہتمام : ——— مصباح القرآن ٹرسٹ ۔ گنگا رام بلڈنگ لاہور

مطبع : ——— معراج دین پرنٹرز ۔ لاہور

اشاعت : ——— مارچ ۱۹۹۷ء

قیمت : ——— Rs 30. روپے

ملنے کا پتہ

قرآن سنٹر

۲۴۔ الفضل مارکیٹ، اُردو بازار ۔ لاہور

فون : ۷۳۱۴۳۱۱

ترتیب

پیش لفظ	۵
تمہید	۷
اسوۂ حسینی کو سمجھنے کی ضرورت	۱۳
اسوۂ حسینی کا ہمہ گیر پہلو	۱۵
رسالت مآب کا طرزِ عمل، حدیبیہ کی صلح اور امن پسندی کا بہترین مظاہرہ	۱۹
امیر المومنین کا طرزِ عمل، صفین کی صلح اور رواداری کی اعلیٰ مثال	۳۳
امام حسن کا امن پسندی و رواداری کے ساتھ حق کی حمایت کا اعلیٰ مظاہرہ	۴۵
حضرت امام حسین کی جنگ اور رواداری و صلح پسندی کے حیرت انگیز مظاہرات	۶۱
مذکورہ بالا واقعات کا نتیجہ	۱۱۵
بات کی صفائی	۱۱۷
چند مختلف سبق	۱۳۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

خداوندِ عالم اور نبی اکرمؐ نے اہل بیت اطہارؑ سے محبت رکھنے کی تاکید فرمائی ہے، تاکہ لوگوں پر ان کی پیروی سہل اور آسان ہو جائے۔ ان کو کثرت فضائل سے نوازا، تاکہ یہ محبت پختہ تر ہو جائے۔ انہیں شفاعت کا حق دیا، تاکہ لوگ اپنی نجات کے لیے ان کی طرف مائل ہوں، نیز انہیں مظلومیت کی شان دی، تاکہ لوگوں کی ہمدردیاں ان کے ساتھ رہیں ان سب باتوں کا ایک ہی مقصد ہے کہ امت اہل بیتؑ کی طرف مائل اور متوجہ رہے اور فلاح پائے۔

تربیت کے لیے اسوۂ و نمونہ کی بڑی اہمیت ہے، یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے نبی اکرمؐ کو امت کے لیے نمونہ قرار دیا۔ پھر آپ نے بعد کے زمانے کے لیے اپنے اہل بیتؑ کو مثالی شخصیتوں کے طور پر متعارف کرایا اور لوگوں کو ان سے محبت رکھنے اور ان کی پیروی کرنے کا واضح حکم دیا، کیونکہ وہ اپنے قول و عمل میں آپ ہی کی مثل و مثال تھے۔ لہذا اسوۂ محمدی، اسوۂ فاطمی، اسوۂ علوی، اسوۂ حسنی اور اسوۂ حسینی شخصیتوں کے تعدد کے باوجود باہمدگر جدا اور الگ نہیں ہیں، اس لیے کہ ان کا جذبہ اور مقصد ایک ہی تھا۔ لہذا اسوہ حسینی دراصل آپ کے چاروں پیش رو بزرگواروں کے اسوۂ کا تسلسل ہے یعنی واقعہ کربلا ان میں سے جس کو بھی پیش آتا، اس کا طرزِ عمل وہی ہوتا جو امام حسینؑ نے اختیار فرمایا تھا۔

امام حسینؑ نے دین کی تفہیم اور دین کے تحفظ کا فریضہ ادا کرنے کے لیے نہایت

منظم اور مربوط طریقے سے قیام فرمایا۔ آپ نے اس معرکے میں شان مظلومیت کے ساتھ باطل کو سرنگوں کیا اور دنیا والوں کو اخلاق، ادب اور فرض شناسی کا ناقابل فراموش درس دیا ہے۔

سیدالعلماء علامہ السید علی نقی النقوی اعلی اللہ مقامہٗ نے زیر نظر کتاب "اسوۂ حسینی" میں ان تمام مطالب کو شرح وبسط سے بیان فرمایا ہے۔ بہت عرصہ پہلے یہ کتاب امامیہ مشن پاکستان کے اہتمام سے طبع ہوئی، لیکن اب یہ نایاب ہوتی جارہی تھی۔ ایسے میں مصباح الہدیٰ پبلی کیشنز نے اسے نئی آب وتاب سے شائع کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

ہم توقع رکھتے ہیں کہ افراد ملت اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر اس کی توسیع اشاعت میں ہمارا ساتھ دیں گے۔ جزاکم اللہ!

لاہور

۲۸ نومبر ۱۹۹۰ء

ڈائرکٹر

مصباح الہدیٰ پبلی کیشنز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ علی سید المرسلین و الہ الطاہرین

من یومنا ھٰذا الیٰ یوم الدین ط

تمہید

انسان کو کمالِ انسانی کی منزل تک پہنچانے کے لیے رب العالمین کی طرف سے جو سلسلہ انبیاء و مرسلین کا قائم ہوا تھا، اس کی انتہا حضرت خاتم النبیین و افضل المرسلین صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات پر ہوئی۔ اور آپ نے تعلیمات الٰہی کا ایک خزانہ قرآن مجید کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ مگر کتاب علم کا سرمایہ بن سکتی ہے۔ عمل کے لیے تربیت درکار ہے۔ اس لیے پیغمبرؐ کے ذمہ تلاوتِ کتاب کے ساتھ تزکیۂ نفوس اور تعلیم کتاب و حکمت کا فریضہ بھی عائد کیا گیا اور آپ کے سیرت و کردار کو خلقِ خدا کے لیے نمونہ بنایا گیا۔ جس کے لیے قرآن میں یہ آیت آئی کہ :

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

(اے رسولؐ) "ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا۔"

اس طرح اسوۂ رسولؐ تمام مسلمانوں کے لیے نمونۂ عمل ہوا۔ مگر رسالت مآبؐ کی بشری زندگی محدود تھی۔ آپ کی وفات کے بعد بھی ضرورت تھی کہ اس کتاب ہدایت قرآنِ مجید کے ساتھ ایسے افراد رہیں جو اخلاق و کمالات میں رسولؐ کے جانشین اور آپ کی طرح دنیا کے لیے نمونۂ عمل بننے کے قابل ہوں، جن کی عملی سیرت کا اتباع بعد سیرتِ رسولؐ نجات و فلاح کا ذمہ دار ہو اور اس طرح وہ قرآن کے ساتھ اور

قرآن ان کے ساتھ ہو۔ ان کے اتباع سے قرآن کا حقیقی اتباع اور قرآن پر عمل کرنے سے ان کے دامن سے تمسک ہوتا ہو۔ یعنی کسی طرح ایک دوسرے سے جدا نہ ہو سکے۔ اسی کے بتلانے کے لیے رسولؐ نے اپنی وہ مشہور حدیث ارشاد فرمائی کہ انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی اہل بیتی ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی انھما لن یفترقا حتیٰ یردا علی الحوض۔

بے شک یہ وہ افراد تھے جن کو رسالت مآبؐ نے اپنے بعد کے لیے دنیا میں نمونۂ عمل قرار دیا تھا۔ اور یہ منظور تھا کہ دنیا اپنی عملی زندگی میں ان کی پیشوائی کو قبول کر کے ان کے نقشِ قدم پر گامزن ہو اور اس طرح کامیابی کے حقیقی نقطۂ ارتقاء پر فائز ہو۔

مگر فرض کے طور پر کسی پابندی کا عائد ہونا اور کسی کے اتباع و اطاعت کا اپنے اوپر لازم و واجب سمجھنا ایک ایسی چیز ہے جو انسانی طبیعت پر گراں گزرتی ہے۔

اس صورت میں اطاعت کا مقصد حاصل تو ہو جاتا ہے مگر ناخوشگواری و گرانی کی بناء پر انسانی طبیعت کو اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی فکر ضرور رہتی ہے۔ اور اس لیے کمزور طبائع کے لوگ خواہش کے مقابلہ میں فرض شناسی کو چھوڑ کے معصیت کے مرتکب بھی ہو جاتے ہیں۔

لیکن اگر یہی فرض کی پابندی کسی طبعی نظام کے تحت میں آ کر انسانی خواہش کے مطابق بن جائے اور انسان کی فطرت کے اعتبار سے اس کے مناسبِ طبع و مذاق ہو جائے تو پھر وہ فرض ایک خوشگوار ذاتی خواہش کے لباس میں آ کر انسان کے لیے بارِ طبع باقی نہیں رہتا اور انسان اسے خوشی خوشی بشاش چہرہ و بشرہ کے ساتھ بجالانے میں لذت محسوس کرتا ہے۔

خدا اور رسولؐ انسانی افتادِ طبع اور اس کے خصوصیات سے پورے طور پر باخبر تھے۔ انھیں رسولؐ کے بعد کچھ افراد کو نمونۂ عمل بنانا تھا اور ان کے اتباع و اطاعت کو فرض قرار دینا تھا لہٰذا ایسے اسباب قرار دینا تھے جو ایک انسان کی طرف لوگوں کے جذبِ قلب کا باعث اور اس کے افعال و اقوال کو مرکزِ توجہ بنا کر ان کے

اتباع واقتداء کی طرف متوجہ کرنے والے ہوں۔

چنانچہ وہ تمام وجوہ واسباب جن سے ایک انسان کی پیروی اور متابعت کی طرف دلوں کو توجہ پیدا ہوتی ہے۔ اہلِ بیت رسولؐ کے لیے مجتمع کر دیے گئے۔

پہلا سبب ایک انسان کی طرف جذب کا ہوتا ہے محبت، بڑے سے بڑا کام جو طبیعت پر گراں گزرتا ہو، محبت کے واسطہ سے لیا جائے۔ تو وہ آسان معلوم ہو گا۔ انسان جس سے محبت کرتا ہے اس کی باتوں کو مانتا ہے۔ اور اس کے اقوال پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ اس سے محبت کرتا ہے تو اس کے افعال سے بھی محبت کرتا ہے۔ اور خود ان کے اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اہلِ بیت رسولؐ کے لیے اس پہلو پر زور دیا گیا اور مختلف طرح مسلمانوں کو ان کی محبت پر آمادہ کیا گیا۔ رسولؐ نے خود محبت کا اظہار کیا اور ایسا کہ جس کی نظیر ملنا ممکن نہیں۔ خالق کی محبت کا اعلان کیا۔ اور ہر طرح قول سے، عمل سے، قرائن سے آثار سے اس کو نمایاں فرمایا۔ پھر مسلمانوں کو محبت کی دعوت دی۔ ان کی محبت اجرِ رسالت ان کی محبت شرطِ ایمان و اطاعت اور ان کی محبت معیار فلاح و نجات قرار دی گئی۔ یہ مسلمانوں کے غور کرنے کی بات ہے کہ آخر رسالت مآبؐ کا اس قدر اظہار محبت اور تاکید مودت کرنا اپنے مخصوص اہل بیتؑ اور عترتِ طاہرینؑ کے متعلق معنی کیا رکھتا ہے؟

کیا یہ سب کچھ صرف اس بناء پر تھا کہ وہ آپ کے اہل بیتؑ تھے۔ یعنی ان میں ایک آپ کی بیٹی تھیں۔ ایک آپ کے داماد اور دو آپ کے نواسے تھے؟ کیا صرف عزیز، قریب اور اولاد ہونے کی بنا پر آپ کو شاں تھے کہ دنیا ان کی گرویدۂ محبت ہو جائے؟

یہ تو حضرت رسولؐ کے بارے میں کچھ اچھا عقیدہ نہیں ہے۔

آپ دنیا میں مبلغ شرع اور مصلحِ خلق بنا کر بھیجے گئے تھے۔ آپ کا فرض تھا، کہ آپ دنیا کو ان باتوں کی ہدایت کریں جو ان کے فلاح و نجاح کی ضامن ہوں اور ان کی زندگی

کے مہذب و شائستہ بنانے میں دخیل ہوں۔ اس لیے اپنی شخصیت اپنے منتسبین اور اپنے اعزا کے رسوخ و اقتدار کو بڑھانا، ان کی طرف لوگوں کے قلوب کو متوجہ کرنا اور دنیا کو ان کا گرویدہ بنانا صرف اس لیے کہ وہ آپ کے عزیز اور رشتہ دار ہیں نفس پروری خودغرضی اور جانبداری کا ایک مظاہرہ ہوگا۔ جو کسی طرح شانِ رسولؐ کے لائق نہیں ہے۔

ایک مسلمان کو تو یہ سمجھنا لازم ہے کہ رسالت مآبؐ کا ان حضرات کی محبت و الفت کی تبلیغ میں اس قدر اہتمام کرنا اسی لیے تھا کہ خدا ان کو مقتدائے خلق اور عملی تعلیمات کا نمونہ بنانا چاہتا تھا۔ اس لیے رسولؐ ان کی ہر دلعزیزی میں اس قدر کوشش و اہتمام میں منہمک تھے۔ آپ نے محبت کا بیج بویا تھا اس لیے کہ اس سے نہالِ اطاعت بارآور ہو۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ کثرتِ فضائل۔ ایک انسان جس کی عظمت اس کے مختلف ذاتی خصوصیات و کمالات کے اعتبار سے انسان کے ذہن نشین ہو چکی ہو۔ اس کے افعال و اعمال کو انسان بہت غائر نظر سے دیکھتا اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اہل بیتِ رسولؐ کو یہ خصوصیت بھی انتہائی معراجِ کمال پر واصل کرتی ہے۔ اور رسولؐ نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ان حضرات کے بیانِ فضائل میں صرف کیا۔ اگر ان کی شخصیتوں کو کوئی ذمہ دارانہ حیثیت دینا منظور نہ تھا، اگر انھیں عام رعیت سے بلند کسی خاص درجہ تک بتانا مقصود نہ تھا تو ان کی شخصیتوں کو اس امتیازی شان سے دنیا میں روشناس کرانے کا کیا مقصد تھا۔ اور ان کے فضائل اس شدومد سے بیان کرنے کی وجہ کیا تھی؟

یقیناً یہ فضائل کا بیان بھی اسی بنا پر تھا۔ کہ یہ مربیٔ خلق اور نمونۂ عمل ہیں۔ لہٰذا ان کے کمالات کو بیش از بیش صورت پر واضح کرنے کی ضرورت تھی۔

تیسرا سبب کسی شخص سے اغراض کا وابستہ ہونا، یہ ایسی چیز ہے کہ انسان کے لیے دوسرے کی طرف جذب ہونے کا باعث اور اس کے افعال و اقوال کی اقتدا کا ذریعہ ہوتی ہے۔

اس خصوصیت کو بھی اہل بیتؑ کے لیے نظر انداز نہیں کیا گیا۔ مسلمانوں کی نظر میں

بے شک دنیا سے زیادہ آخرت کا سوال مقدّم ہے۔ اس لیے دنیا کے نہیں، آخرت کے اغراض اہل بیتؑ سے وابستہ قرار دیے گئے۔ اور ساقیٔ کوثر، حاملِ لوا، قاسمِ جنت و نار، شافعِ خلق وغیرہ الفاظ کے ساتھ ان کے روحانی اقتدار کا سکّہ قائم کیا گیا۔ اس سے بھی یہی منظور تھا کہ دنیا ان توقعات کی بنا پر ہی اطاعت و اتباع پر آمادہ ہو سکے۔ اس لیے کہ کسی سے اعانت، امداد سفارش کی توقع اسی وقت حق بجانب ہوتی ہے جب انسان اس کے مسلک کا سالک، اس کے افعال و اقوال کا پیرو بھی ہو۔ انعامات کے لیے جس طرح استحقاق کی ضرورت ہے اسی طرح مراعات بھی ایک جہتِ استحقاق پر مبنی ہوتی ہے۔ مراحمِ خسروانہ کے سلسلہ میں آزادیاں ہوتی ہیں لیکن جرائم پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ بعض جرائم اتنے سنگین ہوتے ہیں کہ مراحمِ خسروانہ کے تحت میں بھی عفو کے قابل نہیں ہوتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مراحمِ خسروانہ میں بھی استحقاق کو دخل ہے۔

شفاعت، سقایتِ کوثر وغیرہ تمام چیزیں ہیں لیکن انہی لوگوں کے لیے جو استحقاق رکھتے ہوں۔ ان کے لیے نہیں جن کے اعمال دیکھ کر خود شفیع اکرمؐ کو شرم آجائے اور وہ شفاعت سے کنارہ کشی کر لیں۔ اس لیے بہرحال اتباع کی ضرورت ہے۔ تاکہ شفعاء سے آنکھیں چار کرنے کا موقع رہے پھر ناقص انسانیت کی کمزوریوں سے اگر کچھ فرد گذاشتیں رہ جائیں تو اس کے لیے شفاعت و مغفرتِ الٰہی کی توقع رکھنا بے جا نہیں ہے۔

چوتھا سبب ہے مظلومیت، یقیناً مظلوم کی طرف دنیا کا دل کھنچتا اور اس کے افعال و اقوال کے ساتھ غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ اور اس سے بھی اطاعت و اتباع کے مقصد کو تقویت پہنچتی ہے۔

یہ صفت بھی اہلِ بیتِ رسولؐ میں انتہائے حدِ کمال کے ساتھ پائی گئی! ور جیسی مظلومیت کی مثالیں ان میں نظر کے سامنے آئی ہیں دنیا ان کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

بیان مذکور الصدر کے آخری اجزاء کو غائر نظر سے مطالعہ کرنے سے یہ نتیجہ صاف نکل آتا ہے کہ دنیائے فضائل و مناقب اور دنیائے مصائب دونوں میں ایک ہی روح مضمر ہے۔ اور وہ دعوتِ عمل ہے جس سے اصلاحِ خلق کا مقصد انجام پذیر ہوتا ہے۔ لیکن یہ جب ہی ہے کہ جب اہل بیتؑ کے واقعات کو اس نظر سے دیکھا بھی جائے کہ ان سے کون سے سبق حاصل ہوتے ہیں اور انسان کی عملی زندگی کے لیے کیا نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

مگر افسوس ہے کہ دنیا ان مقاصد پر نظر نہیں ڈالتی۔ اور اہل بیت رسولؐ کے تذکرہ ان کی یادگار اور اسی ذیل میں عزائے حضرت امام حسینؑ کے متعلق دو فریق میں منقسم ہو جاتی ہے۔

ایک فریق معترضانہ طور پر اس ذریعہ کی ذاتی حیثیت پر نظر ڈال کر افادی حیثیت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس لیے اس سب کو بیکار کہنے لگتا ہے۔ اور دوسرا فریق معتقدانہ طور پر اس کی ذاتی حیثیت کو مقصد سے الگ کر کے اسے صرف رسوم میں محدود سمجھ لیتا ہے اور اس طرح اصل مقصد کو فوت کر دیتا ہے۔

اسوۂ حسینی کو سمجھنے کی ضرورت

اہل بیت معصومینؑ کی تمام زندگی کی سیرت میں سے کوئی شک نہیں کہ سب سے زیادہ تقریر اور تحریر میں حوالہ "اسوۂ حسینی" کا دیا جاتا ہے اور تاریخ میں نمایاں بھی اتنا ہے کہ بے ساختہ ہر موقع پر ذہن اسی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ مگر عموماً دنیا نے "اسوۂ حسینی" کو صحیح طور پر سمجھا نہیں ہے۔

لوگ ہمیشہ کسی ہنگامۂ انقلاب، کسی حرکتِ عمل، کسی خطرناک اقدام اور ساکن فضا میں تحریک کے لیے حضرت امام حسینؑ کے نام اور کام کا حوالہ دیا کرتے ہیں۔ حالانکہ اسوۂ حسینی جس کا نام ہے وہ کوئی ایک دن کا ایک ہنگامی عمل نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک حکیمانہ ستاون ۵۷ برس کی زندگی کا متوازن کارنامہ ہے جس کی آخری کڑی وہ تھی جو ۶۱ھ کی دسویں محرم کو ہماری آنکھوں کے سامنے آئی۔

ذیل میں جو کچھ ہے وہ اسی "اسوۂ حسینی" کے واضح کرنے کی کوشش ہے۔ جس سے ثابت ہوگا کہ "اسوۂ حسینی" حقیقت میں اپنے پیش رووں سے الگ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک ہی اسوہ ہے۔ جسے اسوۂ "محمدیؐ" "اسوۂ علویؑ" اور "اسوۂ حسنیؑ" بھی کہہ سکتے ہیں اور وہی وقت آنے پر "اسوۂ حسینیؑ" کی بھی شکل میں ہمارے سامنے آیا ہے۔

اسوۂ حسینی کا ہمہ گیر پہلو

رواداری اور امن پسندی کیساتھ حمایتِ باطل سے علیحدگی

وہ چیزیں ہیں اصول اساسی جو پیشوایانِ اسلام اور رہنمایانِ ملت کے طرز عمل میں
توام رہی ہیں اور اسلام کے تعلیمات میں بھی وہ خاص طور سے کار فرما ہیں۔ وہ دونوں
عنصر اگر پہلو بہ پہلو نہ ہوں تو انسان کا طرزِ عمل یا تو حدِ اعتدال سے باہر نکل جائے یا
تفریط کے دائرہ میں رہ جائے۔ اس لیے کہ ہر وقت خاموشی یا ہر وقت حرکت
یہ دو باتیں ایسی ہیں جن میں سے پہلی انسان کے لیے بعض اوقات بزدلی، فرض
شناسی سے علیحدگی اور ادائے فرض میں کوتاہی اور دوسری اکثر اوقات فتنہ و
فساد کا باعث ہوتی ہے۔ انسان کی زندگی میں نہ ہر وقت خاموشی کا ہوتا ہے
اور نہ ہر وقت متحرک ہونے کا۔ بلکہ ہر ایک کے لیے کچھ حدود اور کچھ معیار ہیں۔
جس موقع پر بیٹھے رہنے کی ضرورت ہو۔ وہاں بیٹھ جانا ہی اخلاق کی جان ہے اور
جب کھڑے ہونے کا موقع ہو تو کھڑا ہونا اخلاق کی روح ہے۔

وہ دو اصول اساسی یہ ہیں جنھیں ہر مسلمان کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔
ایک امن و امان کی ضرورت دوسرے حمایتِ باطل سے علیحدگی۔

امن و امان جسے ہمیں اپنے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ "جیو اور جینے دو" اسی
کو فارسی میں "مرنجاں مرنج" کہا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت وہ چیز ہے جس پر تعلیم اسلام
کی بنیاد واقع ہوئی ہے۔ اسلام مشتق ہے "سلم" سے۔ "سلم" کے معنی ہیں صلح پسندی

رسول اسلامؐ نے ارشاد فرمایا۔ المسلم من سلم المسلمون بیدہٖ ولسانہٖ۔
کہیں کہیں یہ بھی میری نظر سے گزرا ہے کہ المسلم من سلم الناس
من یدہٖ ولسانہٖ۔

اصلی مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے اس کے برادران محفوظ رہیں اب خواہ وہ برادرانِ جامعۂ انسانیت ہوں یا برادرانِ جامعۂ مذہب۔ یہ تعلیم وہ ہے جو نظامِ انسانی اور تعلیماتِ اسلامی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یعنی خواہ مخواہ تمھارے ہاتھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ تم کسی سے برسرِ پیکار نہ ہو۔ جہاں تک تمھارے امکان میں ہو خونریزی سے علیٰحدہ رہو۔ کبھی اپنی طرف سے فتنہ و فساد کا سبب نہ بنو۔ دو الفاظ ہیں جو معتقدین اسلام کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک "مسلم"، اور ایک "مومن" "مسلم" "سلم" سے مشتق اور مومن "امن" سے مشتق۔ اس لیے یہ بھی ارشاد ہوا کہ المؤمن من امنہ المسلمون علی دمائھم واموالھم۔ امن پسندی بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ زبانی تعلیمیں برابر اس کے متعلق دی گئیں۔ عملاً اس کی پابندی کر کے ہدایت کی گئی۔ اس کا دائرہ یہاں تک وسیع ہے کہ غیر مسلم کے ساتھ بھی رواداری برتنے کا حکم ہے۔ صلح پسندی سے کام لینے کی ہدایت ہے۔ غیر مسلم اسلام پر اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام میں رواداری نہیں ہے۔ لیکن یہ حقیقتِ حال سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

جناب رسالت مآبؐ کے سچے شاگردِ روحانی یعنی حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام مالکؓ اشتر کو مصر کا حاکم بنا کر بھیج رہے ہیں۔ اس موقع پر ایک عہد لکھ کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کو اپنا لائحہ عمل بنانا۔ اس میں فرماتے ہیں:

لا تکونن علیھم سبعاً ضارباً تغتنم اکلھم فانھم صنفان اما اخ لک فی الدین او نظیر لک فی الخلق۔ تم اہل مصر کے ساتھ وہ طرزِ عمل اختیار نہ کرنا کہ معلوم ہو تم درندہ حیوان ہو جو انھیں کھا لینا چاہتا ہے اس لیے کہ وہاں کے لوگ دو ہی قسم کے ہیں۔ یا تو تمہارے مذہبی بھائی ہیں اور یا خلقت

یعنی جامعۂ انسانیت میں تمھارے شریک ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مساوی طور سے ہر فریق کے ساتھ رواداری کی ہدایت ہو رہی ہے۔

دوسری بات جو سب سے بڑی اور اہم اسلام کی ہدایت ہے وہ یہ ہے کہ حق پر قائم رہو اور باطل کی کبھی حمایت نہ کرو۔ تقویتِ باطل کی ذمہ داری تمھاری طرف عائد نہ ہونے پائے۔ یہ بھی وہ چیز ہے جس پر جناب رسالت مآبؐ اور ان کے پیروانِ حقیقی کے سیرت کی بنیاد قائم ہے۔

امن پسندی اور امن پسندی کے ساتھ ساتھ حمایتِ باطل سے علیحدگی یہی دو عنصر آپ کو ساتھ ساتھ حضرت رسولِ اکرمؐ اور آپ کے اہل بیتؑ کے طرزِ عمل میں ملیں گے۔ یعنی جہاں تک اپنے اوپر حمایتِ باطل کا الزام نہ آتا ہو۔ اس وقت تک چاہے جتنے بھی نقصانات برداشت کرنا پڑیں اور اپنے ذاتی مفاد کی حیثیت سے دبنا بھی پڑے امن پسندی قائم رہے۔ لیکن جس وقت خاموشی میں حمایتِ باطل کی صورت پیدا ہو بس وہیں سے خاموشی کی مہر ٹوٹ جائے اور جس حد تک اقدام ضروری ہو یعنی جس حد تک آگے بڑھنا اس باطل پروری کے الزام سے الگ کر دے وہاں تک اقدام عمل میں لائیں۔ یہ چیز ہے جو رسالت مآبؐ کے طرزِ عمل میں بھی نمایاں ہے۔ اور وہی آلِ رسولؐ کی سیرت میں بھی روشن حروف میں نظر آتی ہے۔

میں جس وقت تاریخ کی روشنی میں نظر ڈالتا ہوں اور رسالتؐ مآب حضرت علیؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے طرزِ عمل کو دیکھتا ہوں تو عمل کے بالکل ملتے جلتے نمونے نظر آتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آئینے متعدد ہیں مگر صورت جو ان میں نظر آرہی ہے، ایک ہے۔ کسی موقع پر صلح اور کسی موقع پر جنگ، انہی دو اصولوں کی آمیزش کا نتیجہ تھی یعنی امن پسندی اور حمایتِ باطل سے علیحدگی۔ مگر عام انسانی طبائع نقطۂ اعتدال پر نہیں ہوا کرتے۔ ان میں اکثر جذبات پائے

جاتے ہیں اور جذبات اکثر عقل و تدبر سے الگ ہوتے ہیں۔ اس لیے صلح کے موقع پر من چلی طبیعتیں صلح کو قابلِ اعتراض سمجھتی اور جنگ کے موقع پر کمزور طبیعتیں جنگ کو ناقابلِ قبول خیال کرتی ہیں مگر وہ افراد جن کے طرزِ عمل کبھی جذبات کے پابند نہیں ہوتے تھے بلکہ ہمیشہ عقل کے پابند تھے وہ صلح کے موقعہ پر جذبۂ انتقام سے مغلوب نہیں ہو جاتے تھے۔ اور جنگ کے موقع پر کمزوری میں گرفتار نہیں ہوتے تھے۔

صلح اور جنگ کے مختلف نقشے

(۱)

رسالت مآبؐ کا طرزِ عمل

حدیبیہ کی صلح اور امن پسندی کا بہترین مظاہرہ

جناب رسالت مآبؐ نے اذیتیں برداشت کیں اور تکلیفیں اٹھائیں۔ ارشاد فرمایا ہے : ما اوذی نبیؐ فط کما اوذیت کسی نبی کو اتنی ایذائیں نہیں دی گئیں جتنی ایذائیں مجھ کو پہنچائی گئیں۔

پتھر پھینکے جاتے تھے اور آپ کا جسدِ مبارک زخمی ہو جاتا تھا۔ کبھی ایسا ہوا ہے کہ آپ پتھروں کے اندر چھپ گئے ہیں۔ کبھی سر اور روئے مبارک پر خون جاری ہو جاتا تھا لیکن زبان کلمۂ حق کے ساتھ گویا رہتی تھی۔ قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا کی آواز بلند تھی۔ اس ثباتِ قدم اور استقلال کے ساتھ اذیتیں برداشت کرنے اور اعلائے کلمۂ حق کی آواز تمام دنیا میں گونج اٹھی اور اُنہی کو جو آپ سے برسرِ پیکار رہتے تھے۔ آپ کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا۔

اشاعتِ دین کے لیے ایک مناسب تر جگہ دستیاب ہو گئی تو حضرتؐ نے مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی اور خاموشی کے ساتھ مدینہ منورہ تشریف لے گئے یہ رواداری کا ثبوت تھا۔ اگر دیکھا جائے تو وہی انصار جو مدینہ منورہ میں آپ کی حمایت کے لیے موجود تھے چڑھائی کر کے مکہ معظمہ بھی آسکتے تھے۔ آپ مکہ میں رہ کر ایسے اسباب مہیا فرماتے،

جن کی بدولت آپ اپنی مخالف جماعت کو مغلوب کر سکتے۔ مگر آپ نے وہاں رہ کر کسی ایسے اقدام کا ارادہ نہیں کیا۔ یہ دکھانے کے لیے کہ تم جتنا بھی ہمیں آزار پہنچاؤ مگر ہم تم سے جنگ کرنا نہیں چاہتے۔ ہم بس اپنے اصول اور اپنی زندگی کو محفوظ کرتے ہوئے تمہارے درمیان ہی سے چلے جاتے ہیں۔

تمہیں ہمارا رہنا منظور نہیں ہے؟ اچھا ہم مدینہ کی طرف جاتے ہیں۔ اب تو "جیو اور جینے دو" کے اصول پر عمل کر کے ہم سے ہاتھ اٹھاؤ۔ مگر وہ جنھیں آپ کی زندگی مکہ معظمہ میں گوارا نہ تھی انھیں آپ کی زندگی مدینہ منورہ میں بھی گوارا نہ ہوئی، وہاں بھی آپ پر چڑھائی کی جانے لگی جب آپ نے دیکھا کہ اب اگر خاموش رہے تو وہ جنھوں نے پناہ دی ہے خطرے میں پڑ جائیں گے۔ اور ان کا شہر ان کے قبضہ سے نکل جائے گا تو اب خاموشی جرم تھی۔ اب آپ نے تلوار اٹھائی۔ اس کے بعد بھی جہاں جہاں تک چڑھائی کر کے وہ آئے آپ نے مدافعت کی چنانچہ جتنی لڑائیاں ہوئیں سب مدافعانہ ہی ہوئیں۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہا جب تک مشرکین کی طاقت میں رمق جان باقی رہی۔ ہر دفعہ وہ شکست کھاتے تھے اور پھر پہلی مرتبہ سے زیادہ طاقت کو بڑھا کر آتے تھے۔

بدر میں شکست ہوئی تو اُحد میں فوج کی تعداد بڑھا کر پوری طاقت سے حملہ کے لیے آئے اور جب پھر شکست ہوئی تو انفرادی طاقت کو کافی نہ سمجھ کر اطراف و جوانب کے قبائل اور یہود کی جماعتوں کے ساتھ متفق ہو کر رسولؐ کے مقابلہ میں آئے اور اس وجہ سے اس جنگ کو جنگِ احزاب کہتے ہیں۔ یعنی اس میں جتنی جماعتیں کفار کی تھیں سب متفق ہو کر رسولؐ سے برسرِ پیکار ہوئی تھیں۔ جب اس میں بھی شکست ہوئی تو ہمتیں پست ہو گئیں۔ اب قریش میں کسی جنبش کی طاقت نہ تھی۔ اس لیے اس کے بعد جو لڑائیاں ہوئیں وہ یہودیوں کے ساتھ ہیں۔ مشرکین مکہ اور قریش کے ساتھ آخری جنگ فیصلہ کن احزاب ہی کی تھی۔

اس کے بعد رسالت مآبؐ نے مکہ معظمہ کا ارادہ کیا حج کے لیے۔ آپ کے ساتھ

ہدی نے (یعنی قربانی کے اونٹ) لے تھے۔ جس سے صاف ظاہر تھا کہ آپ لڑائی کے لیے نہیں جا رہے تھے۔

جس وقت مکہ معظمہ کے قریب پہنچے گو قریش میں طاقت مقابلہ کی نہ تھی ہمتیں پست ہو چکی تھیں مگر عناد کی آگ فرو نہ ہوئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ حج سے روکنے پر آمادہ ہو گئے اور خالد بن الولید کی قیادت میں جو اکثر مورخین کے قول کی بنا پر اب تک حالت کفر میں تھے "کراع الغمیم" مقام تک مقابلہ کے لیے آ گئے۔

ملاحظہ ہو کہ رسالتمآبؐ کی فوج اور آپ کے ساتھیوں کی ہمتیں پے در پے فتوحات حاصل ہونے سے بڑھی ہوئی، مشرکین کی فوج کو متعدد بار شکست دیئے ہوئے، اس صورت میں رسالتمآبؐ کے لیے عام اقتضاء طبع کی بنا پر یہ مناسب تھا کہ آپ اپنی فوج کو جو سلاح جنگ سے آراستہ تھی ہی حملہ کا حکم دے دیتے اور دشمن کو شکست دے کر مکہ معظمہ پر قبضہ کرتے۔

مگر آپ کو یہ دکھانا منظور تھا کہ ہم جب مجبور کئے جاتے ہیں تب ہی لڑتے ہیں گرد و غبار اٹھتا ہوا نظر آیا۔ اصحاب کی نظریں اٹھیں، معلوم ہوا لشکر آ رہا ہے۔ آپ نے فرمایا، اس راستے کو چھوڑ دو۔ دوسرے راستے سے چلو طبری نے لکھا ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا، کون شخص ہے جو ہم کو کسی دوسرے راستے سے نکال لے چلے۔ اس راہ کے علاوہ جس پر یہ ہیں۔

یہ اس بات کا ثبوت دینا تھا کہ ہمیں لڑنا نہیں منظور ہے۔ چنانچہ حضرتؐ نے داہنی جانب کا رخ کیا "حمض" کی پشت پر "ثنیتہ المرار" سے ہوتے ہوئے "حدیبیہ" کو جو راستہ جاتا ہے ادھر متوجہ ہوئے۔

مخالف فوج کی پست ہمتی اسی سے ظاہر ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ

لہ طبری ج ۳ ص ۷۳

صرف عناد سے مشتعل ہو کر سامنے نکل آئے تھے۔ مگر لڑنے کے لیے تیار نہ تھے کہ انھوں نے جب دیکھا کہ رسالت مآبؐ نے راستہ بدل لیا تو وہ بھی واپس آگئے۔

یہ امن پسندی کا سب سے بڑا ثبوت تھا جو رسالت مآبؐ نے دیا۔

اب مشرکین نے اپنی طرف سے نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کیا۔ عروۃ بن مسعود ثقفی آیا جس نے گفتگوئے صلح کا آغاز کیا۔ حالت یہ تھی کہ مغیرہ بن شعبہ حضرتؐ کے سر پر تلوار کا سایہ کیے کھڑے تھے۔ عروہ اثنائے گفتگو میں اپنا ہاتھ بار بار حضرتؐ کے چہرہ کے قریب لاتا تھا جس طرح بے باکی سے باتیں کی جاتی ہیں۔ جب اس کا ہاتھ حضرتؐ کے چہرہ کے قریب آتا تھا مغیرہ کی تلوار اس کے ہاتھ پر جھکتی تھی۔

عروہ نے خود کفار کے پاس جا کر کہا کہ میں نے کسریٰ، قیصر اور نجاشی بڑے بڑے سلاطین کے دربار دیکھے ہیں، مگر ان بادشاہوں کی ہیبت میری نظر میں اتنی نہیں سمائی جتنی اس رسولؐ کی۔ حضرتؐ کی صلح پسندانہ باتوں سے خوشگوار توقعات قائم ہو چکے تھے۔ سہیل بن عمرو قریش کا نمائندہ بن کر مختتم گفتگوئے صلح کے لیے حضرتؐ کے پاس بھیج دیا۔ اور اس نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ اس سال آپ واپس جائیے اور حج نہ کیجیے! اس کے بعد دیکھا جائے گا۔

خیال کرنے کی بات ہے کہ منزلوں کی مسافت قطع کر کے اتنی بڑی جماعت حج کے لیے آئی ہو اور اسے روکا جائے۔

مگر حضرتؐ نے فرمایا کہ اچھا ہم واپس چلے جائیں گے۔ یہ انتہائی صلح پسندی کا ثبوت ہے۔ اس کے بعد ملاحظہ ہو کہ صلح نامہ کے شرائط کیا ہیں۔ عام الفاظ میں تو یہی کہنا چاہیے کہ آپ نے دب کر صلح کی۔ یعنی شرائط ایسے قرار دیے جو کفارِ قریش کی مرضی کے مطابق اور بظاہر آپ کی مصلحت کے خلاف تھے مگر حضرتؐ نے ان سب کو منظور کیا اور تمام باتوں کا تحمل فرما لیا۔

وقت آیا کتابتِ عہد نامہ کا۔ اور حضرتؐ نے امیر المومنینؑ علیؑ کو صلح نامہ کی

تحریر کا حکم دیا۔ آپ نے اپنی عادت کے مطابق کاغذ لیا اور سرنامہ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تحریر فرمایا۔ اس میں کون سی بات تھی؟ خدا کا نام تھا اور اسلامی نشان۔ مگر سہیل نے اعتراض کیا۔

"یہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہم نہیں جانتے۔ وہی لکھو جو ہماری تحریروں میں لکھا جاتا ہے۔ "باسمك اللهم" اگر یہ فقرہ کوئی غلط معنی رکھتا ہوتا، تو یہیں سے دوسرا شعبہ اسلام کی عملی تعلیم کا سامنے آجاتا، کہ حمایتِ باطل نہ ہونا چاہیے" لیکن معنی کا کوئی فرق نہ تھا۔ اسم مظہر نہ سہی ضمیر خطاب سہی کہ "خداوندا تیرے نام سے شروع کرتا ہوں"۔ بات ایک ہی تھی، لہٰذا حضرتؑ نے رواداری صرف فرمائی۔ یہ دکھلایا کہ ہم لفظی بحث میں نہیں پڑتے، معنی پر نظر رکھتے ہیں۔ لہٰذا لکھا گیا۔

باسمك اللّٰهم۔ اس کے بعد جناب رسالت مآبؐ نے صلح نامہ کا مضمون بتانا شروع کیا۔ اور امیرالمومنینؑ لکھنے لگے۔ فرمایا لکھو۔ هذا ما صالح عليه محمد رسول الله، سهيل بن عمرو۔

"یہ وہ معاہدہ ہے جس کے اوپر صلح ہوئی، خدا کے رسول محمدؐ اور سہیل بن عمرو کے درمیان"۔ سہیل نے اعتراض کیا۔

"لو شهدت انك رسول الله لما قاتلتك ولكن اكتب اسمك واسم ابيك"

"ہم اگر آپ کو خدا کا رسولؐ سمجھتے تو آپ سے برسر پیکار کیوں ہوتے؟ لہٰذا آپ بس اپنے اور اپنے والد کا نام لکھیے ارسولؐ اللہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے)"

رسالت مآبؐ دنیا کو تعلیم دینا چاہتے تھے کہ واقعیت جو ہوتی ہے وہ ہزار پردوں میں بھی واقعیت ہی رہتی ہے۔ اپنے نام کے ساتھ سے کسی لقب کو ہٹا دینا یہ کسی حقیقت کو بدل نہیں سکتا۔ آپ نے فرمایا۔ کہ "ہاں ہاں! یہی لکھو! میں تو

ہوں ہی خدا کا رسولؐ! لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

یہ دوسری رواداری کی بہت بڑی مثال ہے۔ یہ دکھانا منظور ہے کہ مصالحت کے موقع پر کفار کے ساتھ بھی مساویانہ برتاؤ کرنا چاہیے۔ جس طرح سے اس کا نام لکھا گیا اسی طرح اپنا نام لکھوایا۔ تحریر ہوا۔

ھذا ما صالح علیہ محمد بن عبد اللہ سھیل بن عمرو۔

"یہ وہ ہے جس پر صلح کی عبد اللہ کے بیٹے محمدؐ نے عمرو کے بیٹے سہیل کے ساتھ۔"

اس کے بعد شرائط صلح درج کیے گئے۔ ایک شرط یہ تھی کہ دس برس تک ہمارے درمیان جنگ نہ ہو گی۔ اس میں لوگ امن وامان کے ساتھ رہیں گے اور ایک دوسرے سے ہاتھ روکے رہے گا۔"

دوسری شرط یہ ہے جو عجیب شرط ہے کہ جو شخص قریش میں سے بغیر اپنے ولی کی اجازت کے رسول اللہؐ کے پاس چلا جائے (اکثر لوگوں کے بھائی، بیٹے یا دوسرے عزیز مسلمان ہو جاتے تھے تو ان پر سختیاں ہوتی تھیں، وہ مدینہ منورہ چلے جاتے تھے) تو ایسے لوگوں کو آپ مشرکین کی طرف واپس کر دیں گے۔ مگر جب آپ کے پاس سے کوئی نکل کر قریش کے پاس چلا جائے تو قریش واپس نہ کریں گے۔

اس کے بعد جو شخص رسالت مآبؐ سے حلیف ہونا چاہے وہ آپ کا حلیف ہو جائے اور جو قریش کے ساتھ ہم عہد و پیمان ہونا چاہے وہ ان کے ساتھ ہو جائے۔"

اس شرط کے ہونے کے ساتھ ہی قبیلہ خزاعہ کے نمائندے اپنی جگہ سے اٹھے اور اعلان کیا کہ ہم رسولؐ کے عہد و امان میں ہیں اور بنی بکر اٹھے، انھوں نے کہا ہم قریش کے عہد و پیمان میں ہیں۔

اور یہ شرط ہوئی ہے کہ آپ اس سال واپس جائیں اور مکہ میں داخل نہ ہوں آئندہ سال ہم آپ کے لیے مکہ کو خالی کر دیں گے۔ اور آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ میں داخل ہو جیے گا۔ اس شرط کے ساتھ کہ تین دن سے زیادہ قیام نہ ہو، اور آپ

کے ساتھ اس طرح کے ہتھیار ہوں جو مسافر اپنے ساتھ رکھتے ہوں یعنی تلواریں نیام کے اندر، اس کے علاوہ اور کچھ آپ کے ساتھ نہ ہو۔"

اب آپ فیصلہ فرمایئے کہ رسولؐ کی طرف سے کتنی رواداری کی گئی؟ ایسا شخص جس کے ساتھ فوج ولشکر موجود ہو، لشکر بھی ایسا جس کے دل میں فتح مکہ کا خیال قائم ہو چکا ہو۔ اسس لیے کہ آپ اس کے قبل خواب دیکھ چکے تھے جس کو آپ نے اپنے اصحاب سے بیان فرمایا تھا اور وہ یہ کہ آپ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے ہیں۔

اصحاب کو یقین تھا کہ مکہ ضرور فتح ہو جائے گا۔ اس سب کے باوجود رسولؐ نے بظاہر دب کر صلح کی۔

اس کا نتیجہ تھا کہ وہ بے چین طبیعتیں جو رسولؐ کی مصلحت کی تہ تک نہیں پہنچ سکتی تھیں بے تاب ہو گئیں۔ طبری میں ہے کہ:

"رسالت مآبؐ کے اصحاب مدینہ سے یہ سمجھ کر روانہ ہوئے تھے کہ ہم مکہ معظمہ ضرور فتح کرلیں گے ایک خواب کی بنا پر جو جناب رسالت مآبؐ نے دیکھا تھا، اب جو انھوں نے دیکھا کہ صلح ہو گئی اور آپ واپس جا رہے ہیں اور یہ پابندیاں آپ نے اپنے اوپر عائد کی ہیں تو لوگوں کے دلوں میں امرِ عظیم پیدا ہوا۔ یہاں تک کہ قریب تھا کہ وہ ہلاکتِ ابدی میں واقع ہو جائیں، یعنی عقائد میں تزلزل ہوا اور ایسا کہ قریب تھا کفر میں مبتلا ہو جائیں[1]"

اسس ناراضگی کے مظاہرات میں سے ایک یہ تھا کہ جب رسالت مآبؐ نے معاہدہ سے فراغت حاصل کی تو تمام اصحاب سے فرمایا کہ اٹھو اور نحر کرو۔ پھر حلق کرو یعنی سر کے بال منڈاؤ اور حج کو عمرہ سے بدل کر واپس چلو۔ مگر رسولؐ حکم دے رہے ہیں اور کوئی تعمیل کے لیے نہیں اٹھتا۔ یہاں تک کہ حضرتؐ نے تین مرتبہ بھی فرمایا جب کوئی

---

[1] طبری ج ۳ ص ۷۹۔

کھڑا نہ ہؤا تو آپ کبیدہ خاطر ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ام المومنین ام سلمہؓ کے پاس جو اس سفر میں آپ کے ساتھ تھیں تشریف لے گئے اور ان سے ان واقعات کا تذکرہ کیا۔ ام سلمہؓ نے عرض کیا کہ حضور چاہتے ہیں کہ ایسا ہو تو خود تشریف لے جائیے اور کسی سے کچھ کہے بغیر خود آپ اپنے شتر قربانی کو نحر فرمائیے۔ اور حلق راس کرا لیجئے" حضرتؐ کو یہ مشورہ پسند آیا اور آپ نے باہر آکر کسی سے کچھ کہا نہیں، مگر آپ نے خود نحر و حلق سے فراغت فرمالی جب لوگوں نے یہ دیکھا تو چارو ناچار مجبور ہو کر کھڑے ہوئے اور انھوں نے ایک دوسرے کے سروں کو حلق کرنا شروع کیا۔ مگر رنج اور صدمہ کا یہ عالم تھا، کہ معلوم ہوتا تھا ایک دوسرے کو قتل کر رہا ہے[1]

بے شک تاریخ کے فقرات اس موقع پر بتلاتے ہیں کہ تمام صحابہؓ کرام بلا استثناء اس صلح سے ناراض تھے۔ اور ان کے دلوں میں شکوک وشبہات گردش کر رہے تھے، مگر واقعہ ایسا نہیں ہے۔ بعض ایسے بھی تھے جن کے دل میں شک پیدا نہ ہوا تھا۔

حضرت علی بن ابی طالبؑ کا تو ذکر ہی نہیں اس لیے کہ وہ تو کاتب صلح نامہ ہی تھے۔ بلکہ طبری کی ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ سہیل ابن عمرو کفار کا نمائندہ اور رسالت مآبؐ کے نمائندہ حضرت علیؑ تھے۔ چنانچہ اس میں ہے کہ، ان قریشا بعثوا سهيل بن عمرو وحويطبا فولوهم صلحهم وبعث النبی صلی الله علیه وسلم علیاً علیه السلام فی صلحه۔

"قریش نے سہیل بن عمرو اور حویطب کو صلح کا اختیار دے کر بھیجا اور رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ کو صلح کا مختار بنایا[2]"

اسی وجہ سے دوسرے سال جب رسالت مآبؐ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے

---

[1] طبری ج ۳ ص ۸۰۔ [2] طبری جلد ۳ ص ۷۷۔

اور تین روز کی مدت جس تک قیام کا وعدہ تھا منقضی ہوگئی۔ تو کفار قریش حضرت علیؑ ہی کے پاس آئے تھے اور کہا تھا کہ قل لصاحبك اخرج عنا فقد مضی الاجل۔

"اپنے رفیق (رسولؐ) سے کہیے کہ بس اب مکہ سے باہر جائیے۔ مدت ختم ہوگئی۔"

اس کو سن کر رسالت مآبؐ مکہ سے تشریف لے گئے[1]

اس سے ظاہر ہے کہ کفارِ قریش صلح کا بڑا ذمہ دار حضرت علیؑ کو سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے قرار دادِ صلح کی یاد دہانی کے لیے آپ ہی کی طرف رجوع مناسب سمجھی۔ لیکن حضرت کے علاوہ دوسرے صحابہ بھی کچھ نہ کچھ ایسے تھے کہ جن کو کوئی شک و شبہ پیدا نہ ہوا تھا۔ اور وہ ثبات و استقامت کے ساتھ اپنے مضبوط عقیدہ پر قائم رہے تھے۔

چنانچہ طبری میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ جب رسالت مآبؐ نے حکم دیا کہ تم سب کے سب تحلیق کرو تو پہلے لوگ آمادہ ہی نہیں ہوتے تھے حضرتؐ نے دوسروں کو نظر انداز کر کے خود تحلیق فرمائی۔

(تحلیق کے معنی) ہیں سر کو استرے سے منڈوانا، اس کے خلاف صورت ایک ہے "تقصیر" یعنی بالوں کو کہیں کہیں سے ترشوا لینا)

تو صحابہ چار و ناچار اٹھے مگر تاریخ میں ہے کہ حلق رجال یوم الحدیبیہ و قصر آخرون۔ کچھ لوگ ایسے تھے حدیبیہ میں جنھوں نے تحلیق کی اور باقی جتنے تھے سب نے تقصیر کی۔ یعنی بس تھوڑے سے بال ترشوانے پر اکتفا کی۔

حضرتؐ نے فرمایا۔ "یرحم اللہ المحلقین" "خدا اپنی رحمت

---

[1] طبری ج ۳ ص ۸۰

نازل کرے محلقین یعنی بال منڈوانے والوں پر۔"

لوگوں نے کہا والمقصرین یارسول اللہ۔ اور تقصیر کرنے والوں پر۔"

آپ نے پھر فرمایا۔

یرحم اللہ المحلقین"۔ خدا رحمت نازل کرے محلقین پر" پھر آواز آئی۔ والمقصرین یارسول اللہ۔ خدا کے رسولؐ! بہت سے لوگ مقصرین بھی تو ہیں، ان کے لیے بھی تو ارشاد فرمایئے۔" حضرت نے فرمایا والمقصرین اچھا مقصرین بھی سہی۔"

اب یہ تاریخ کا فقرہ قابل ملاحظہ ہے جو حقیقت حال اور صورت واقعہ کا آئینہ بردار اور پورے طور سے مظہر ہے کہ لوگوں نے عرض کیا۔ یارسول اللہؐ آپ نے محلقین کے لیے تین مرتبہ دعائے رحمت کیوں کی؟ حضرت نے فرمایا لانھم لم یشکوا۔

"اس لیے کہ ان کے دل میں شک کا گزر نہ ہوا تھا" (طبری ج ۳ ص ۸۱)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ایک جماعت ایسی موجود تھی۔ جس کے دل میں شک پیدا نہیں ہوا تھا۔ اب اگر ہم تاریخ کے اندر یہ فقرات دیکھیں۔ دخل الناس من ذالك امر عظیم۔ لوگوں کے دل میں امر عظیم داخل ہوا۔" یا یہ کہ رسالت مآبؐ نے کہا تحلیق کرو۔ لیکن ماقام منھم رجل۔ کوئی شخص نہ کھڑا ہوا"۔

تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ تاریخ کے الفاظ میں کوتاہی کی جھلک ہے اور استثناء نظر انداز ہو گیا ہے۔ یا ابتداء تحلیق کا حکم جس مجمع میں دیا گیا تھا اس میں وہی لوگ موجود تھے کہ جن کے دلوں میں شکوک کا گزر تھا۔ اور دوسرے لوگ اس وقت موجود نہ تھے۔ اور رسالت مآبؐ نے ان کو خاص طور سے حکم دینا ضروری نہ سمجھا تھا۔ اس اطمینان پر کہ ان سے تو جب کہا جائے گا یہ تحلیق کر ہی لیں گے۔ بہرحال صلح ہو گئی اور رسالت مآبؐ نے صلح کر لی۔ کفار کی انتہائی جابرانہ شرائط

کو منظور کر لیا۔ صرف اس بنا پر کہ اگر جنگ ہوتی تو مکہ فتح ہو جاتا مگر یہ کہنے کو ہوتا کہ خود چڑھ کر آئے اور ہمارا شہر فتح کیا۔ لہذا آپ نے اس کا موقع نہیں دیا۔ آپ نے صلح کی اور اس کی پابندی اس حد تک فرمائی کہ ابھی یہ تحریر خشک بھی نہ ہوئی تھی کہ سہیل (نمائندہ صلح) کا لڑکا جو پہلے مسلمان ہو چکا تھا، زنجیروں میں گرفتار وا محمداہ وا محمداہ کہتا ہوا آیا اور اپنے کو رسولؐ کے سامنے ڈال دیا۔

سہیل نے جو دیکھا تو کھڑا ہو گیا، اس نے طمانچہ لگایا اور گریبان پکڑ کر کھینچتا ہوا لے چلا۔ رسالت مآبؐ خاموش دیکھتے رہے۔ اس نے پکار کر آواز دی۔

"کیوں مسلمانو! کیا میں پھر مشرکین میں واپس کر دیا جاؤں گا۔ کہ وہ مجھ کو میرے دین سے منحرف کریں۔" حضرتؐ نے کچھ تعرض نہ فرمایا بے شک دل پر اثر ضرور ہوا اور فرمایا:

"اے ابوجندل صبر کر، اس لیے کہ یہ چند دنوں کی تکلیف ہے۔ خدا تیرے لیے اور تمام کمزور مسلمانوں کے لیے جو مشرکین کے پنجہ میں گرفتار ہیں، اپنی طرف سے کشائش پیدا کرے گا۔ ہم نے اس قوم کے ساتھ ایک عہد کر لیا ہے اور ایک پیمان ہو گیا ہے۔ ہم اس کی مخالفت نہیں کر سکتے۔"[1]

(یہ فقرہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ آئندہ کی سیرتوں میں ایسے ہی فقرے نظر سے گزریں گے)

عہد نامہ مکمل ہو گیا۔ حضرتؐ نے اپنی طرف سے تو اس کی سختی کے ساتھ پابندی کی مگر مشرکین کی طرف سے عہد شکنی شروع ہوئی۔

قبیلۂ خزاعہ آپؐ کا حلیف ہوا تھا۔ اور بنی بکر نے مشرکین کے ساتھ حلیف ہونے کا اعلان کیا تھا جس کا تذکرہ سابق میں ہو چکا۔ ان دونوں قبیلوں میں پہلے

---

[1] طبری جلد ۳ صـ ۷۹، ۸۰

سے عداوت تھی۔ اس لیے دونوں ہی ایک دوسرے کے خلاف تیار رہتے تھے لیکن اب جبو قت کہ رسالت مآبؐ اور قریش کے درمیاں عہد ہو گیا۔ اور خزاعہ رسالت مآبؐ کے اور بنی بکر قریش کے حلیف ہو گئے اور یہ معاہدہ ہوا کہ آپس میں دس برس تک جنگ نہ ہو گی۔ تو اب خزاعہ کے لوگ مطمئن ہو گئے اسلحہ جسم سے اتار ڈالے اور جنگ کی تیاریاں ترک کر دیں یہ موقع بنی بکر کو غنیمت معلوم ہؤا اور انھوں نے بنی خزاعہ پر جبکہ وہ ایک چشمہ کے پاس مقیم تھے اچانک حملہ کر دیا۔ اور بہت سے لوگوں کو قتل کیا۔

قریش کے آدمیوں نے بھی ظاہری طور سے نہیں تو مخفی طور پر ان لوگوں کی امداد کی اور قبیلہ خزاعہ سخت نقصانات سے دوچار ہؤا۔

عہد نامہ کے اصول کے مطابق قریش کا فرض تھا کہ وہ بنی بکر اپنے حلفاء کو تنبیہہ کرتے اور معاہدہ کے احترام پر مجبور کرتے۔ مگر قریش نے اور ان کی تائید کی اس پر قبیلۂ خزاعہ کا ایک آدمی فریاد کرتا ہوا مدینہ گیا اور رسالت مآبؐ کے سامنے پہنچ کر جب کہ حضرتؐ تمام لوگوں کے مجمع میں مسجد کے اندر رونق افروز تھے، یہ اشعار پڑھنا شروع کیے۔

لاھم انی ناشد محمدا　　　حلف ابنیا دابیہ الاتلدا

"خداوندا میں یاد دلاتا ہوں محمدؐ کو وہ پیمانِ محبت جو ہمارے اور ان کے آباؤ اجداد کے درمیان رہا کیا۔"

فوالد اکنتا وکنت ولدا　　　ثمت اسلمنا فلم ننزع یدا

"آپ ہمارے درمیان ہمارے بچوں کی طرح پیدا ہوئے، پلے، بڑھے اور بڑے ہوئے۔ پھر آپ نے دعوتِ اسلام دی تو ہم اسلام لائے، اور آپ کی مخالفت نہیں کی۔"

فانصر رسول اللہ نصرا عتدا　　　وادع عباد اللہ یاتوا مددا

"اس وقت مدد کیجئے اے خدا کے رسولؐ مضبوط مدد اور خدا کے بندوں کو آواز

دیجیئے کہ وہ امداد کو آپ کی طرف مجتمع ہو جائیں۔"

فیھم رسول اللہ قد تجردا　　ابیض مثل البدر ینمی صعدا

"اس مجمع میں خدا کا رسولؐ بے نقاب صورت سے اس طرح نظر آئے
جیسے ماہِ شب چہاردہ وفورِ نور و ضیاء کے ساتھ۔"

ان سیم خسفا وجھہ تربدا　　فی فیلق کالبحر یجری مزبدا

"رسالت مآبؐ بے جا ظلم کو برداشت نہیں کر سکتے اگر کوئی ان کو ذلت
پہنچانا چاہے تو غصہ سے ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جائے۔ اور وہ ایسے
لشکر کے ساتھ چل کھڑے ہوں جو سمندر کی طرح بہ رہا ہو۔"

ان قریشا اخلفوک الموعدا　　ونقضوا میثاقک المؤکدا

"اے خدا کے رسولؐ آپ کو معلوم ہو کہ قریش نے آپ سے عہد خلافی کی اور
آپ کے ساتھ جو پیمان ہوا تھا اس کو توڑ دیا گیا۔"

وجعلوا لی فی کداء رصدا　　وزعموا ان لست ادعو احدا

"انھوں نے (بنی بکر نے) چشمہ کے کنارہ پر کمین گاہ سے ہمارے اوپر حملہ
کر دیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ہمارا کوئی فریاد رس نہیں ہے۔"

وھم اذل واقل عددا　　ھم بیتونا بالوتیر ھجدا

فقتلونا رکعا وسجدا

"اگر ہم جنگ کے لیے تیار ہوتے تو بھلا ان کی کیا مجال تھی کہ وہ ہم سے مقابلہ
کرتے، وہ تعداد میں بھی کم اور وجاہت کے اعتبار سے بھی بہت حقیر تھے،
مگر ہم تو نمازِ شب میں مصروف تھے، انھوں نے رکوع و سجود کی حالت میں ہم
کو آکر قتل کیا۔"

یہ چیز ایسی تھی کہ اس کے بعد خاموش رہنا اخلاقی جرم تھا۔ مگر ہو سکتا تھا
کہ آپؐ جواب میں مختصر سہی، ایک نقرہ بر فرماتے، کہ "میں نے جو کچھ تم نے کہا
وہ سنا، اس پر ہمدردی کے ساتھ غور کیا جائے گا۔ بے شک قریش ان واقعات

کی بنا، پر جو تم نے بیان کیے ہیں، معاہدہ کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے ہیں اور اس کا مناسب تدارک ضروری معلوم ہوتا ہے۔" عام سیاست دانوں کا انداز یہی ہوتا ہے، مگر اس صورت میں مخاطب کو نتیجہ کے حصول میں صبر آزما انتظار کرنا پڑتا ہے۔ حضرتؐ نے اس کے برخلاف اس کی تقریر سنتے ہی مسافتِ کلام کو مختصر کر دیا اور ایک مرتبہ فرمایا کہ "قد نصرت یا عمرو بن سالم" تمہاری مدد ہوگئی اے عمرو بن سالم"۔ جس کے بعد حضرتؐ نے فوج کشی فرمائی اور نتیجہ فتح مکہ کی صورت میں نمودار ہوا۔

اس صورتِ واقعات سے ظاہر ہے کہ نہ وہ صلح کمزوری کی دلیل تھی اور نہ جنگ بے موقع غیظ و غضب کا نتیجہ۔ بلکہ دونوں باتیں حکیمانہ فرض شناسی کا نتیجہ تھیں۔ اور اس وقت تک رواداری سے کام لیا گیا، جب تک حمایتِ باطل کا سبب نہ ہوا اور جب نصرتِ حق کی ضرورت ہوئی تو اس فریضہ کو انجام دیا گیا۔

امیر المومنینؑ کا طرزِ عمل

صفین کی صلح اور رواداری کی اعلیٰ مثال

جنابِ امیرؑ کا طرزِ عمل بھی سیرتِ رسولؐ کا آئینہ تھا۔ ہم اس دور کے تفصیلی حالات کے بیان سے کنارہ کرتے ہوئے جو بدقسمتی سے مسلمانوں کے باہمی مناظرہ کا مرکز بن گیا ہے اس دور کے متعلق اجمالاً صرف اتنا حوالہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ اس دور میں کاملاً رواداری پر اس طرح عمل ہوا کہ جنگ کی کوئی مثال ملتی ہی نہیں۔

اس کے بعد ۳۵ھ میں جب مسلمانوں نے آپ سے بیعت کی۔ اس وقت ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے آپ کی بیعت سے کنارہ کشی کی۔ جیسے اسامہ بن زید حسان بن ثابت، عبداللہ بن عمر اور سعد بن ابی وقاص وغیرہ۔ لیکن حضرت کی طرف سے ان کے خلاف کوئی سختی نہیں ہوئی، نہ ان کو بیعت پر مجبور کیا گیا اور نہ ان کو کسی طرح کی ایذا رسانی کی گئی۔

باوجودیکہ تمام مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے آپ کی بیعت مکمل ہو چکی تھی، اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن آپ نے بیعت نہ کرنے کی وجہ سے کسی پر کوئی سختی کی ہو۔ تاریخ اس کا پتہ دینے سے قاصر ہے۔

یہ رواداری کا بے نظیر نمونہ ہے۔

مگر جس وقت خاموشی میں حمایتِ باطل کا پہلو دیکھا۔ یعنی شام کے تخت پر معاویہ نے بحیثیت بادشاہ قبضہ رکھنے کا ارادہ کیا تو چونکہ ان کا بطور گورنر کے باقی رکھنا باطل پروری کا الزام اپنے اوپر عائد کرنا تھا[1] اس لیے آپ نے

---

[1] ملاحظہ ہو شیخ الاسلام تقی الدین ابن تیمیہ کی کتاب "السیاسۃ الشرعیہ فی اصلاح الراعی والرعیہ" مطبوعہ مصر ص۳ میں حسب ذیل روایات۔

خاموش ۔ پھر بھی آپ نے امکانی حد تک رواداری کے مسلک سے انحراف نہیں کیا۔ آپ نے معاویہ کے نام جو خط تحریر فرمایا اس میں کوئی تشدد نہیں معلوم ہوتا، نہ لب ولہجہ میں کوئی تلخی ہے صرف اتنا ہے کہ وہ پروانۂ حکومت نہیں ہے۔ اگر طرف مقابل میں رواداری کے عنصر کا کسی حد تک بھی وجود ہوتا تو یہ خط کسی طرح فتنہ وفساد کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا تھا۔

واقدی کی کتاب الجمل میں اس خط کا مضمون حسب ذیل ہے:

"من عبد اللہ علیؑ امیر المومنین الی معاویۃ بن ابی سفیان۔ اما بعد۔ فقد علمت اعذاری فیکم واعراضی عنکم حتی کان مالا بد منہ ولا دفع لہ والحدیث طویل والکلام کثیر وقد ادبر ما ادبر واقبل ما اقبل فبایع من قبلک واقبل الیّ فی وفد من اصحابک۔"

تم کو معلوم ہوگا کہ میں نے مسلمانوں کی خلافت قبول کرنے میں حجت تمام کر دی اور پوری بے توجہی کا اظہار کیا۔ مگر وہ ہوا کہ جو ہونے والا تھا، اور جس سے کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

بہر حال قصہ طولانی ہے اور باتیں بہت۔ جو کچھ ہو چکنے والا تھا وہ ہو چکا اور جو صورتیں پیش آنے والی ہیں وہ پیش ہیں۔ تم کو چاہیے کہ تمام رعایائے شام سے میری بیعت حاصل کرو۔ اور اپنے اہلِ مملکت کے ایک منتخب وفد کے ساتھ میرے پاس آؤ۔ (نہج البلاغہ ج ۲ مطبوعہ مصر ص ۱۴۰)

یہی پہلا خط ہے جس کے پہنچتے ہی مخالفت کی آگ مشتعل ہوگئی۔

میں دنیا کو متوجہ کرتا ہوں اور فیصلہ چاہتا ہوں کہ اس خط کے اندر کون سا لفظ رواداری کے خلاف ہے۔

مگر اس کے جواب میں جو صورت پیش آئی وہ دنیا کو معلوم ہے۔ آپ پر تنقیِ

عثمانؓ کا الزام عائد کیا گیا اور ایک طوفان مخالفت کا آپ کے خلاف برپا کر دیا گیا۔
خلیفہ سوم عثمانؓ کا خون بھرا کرتا اور ان کی بیوی نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں سال بھر تک دمشق کے منبر پر آویزاں رہیں جس کے گرد ہزاروں آدمی نوحہ و ماتم کرتے تھے (طبری ج ۵ ص ۲۳۵)

اس طرح مخالفت کے جذبات کو حضرتؑ کے خلاف مشتعل کیا گیا۔ فوج کشی ہوئی اور آپ سے جنگ کی تیاری کی گئی۔

اس کے بعد بھی حضرت نے متعدد خطوط کے ذریعہ سے فہمائش کی کہ معاملہ رفع دفع ہو جائے۔ اور جنگ کی صورت نہ پیدا ہو۔ لیکن اس روادارانہ طریقہ کا جواب تشدد پسندانہ طرزِ عمل سے ملا۔

آپ نے جریر بن عبداللہ بجلی کو دمشق بھیجا کہ کسی صورت سے معاملات روبراصلاح ہو جائیں۔ مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ یہاں تک کہ لڑائی ٹھنی اور بہت بڑی فوج آپ سے مقابلہ کے لیے میدانِ کارزار میں آ گئی۔

اب ملاحظہ فرمایئے، ایک طرف ایک بادشاہ ہے جو تمام مسلمانوں کے اتفاق آراء سے خلیفہ تسلیم کیا جا چکا ہے۔ دوسری طرف ایک ایسا شخص ہے جس کی حیثیت اس کے قبل ایک گورنر کی تھی اور اب ایک باغی کی حیثیت سے میدان میں آیا ہے۔ لیکن شاہانہ گھمنڈ، سخن پروری، خودداری کے بجائے صرف رواداری کے خیال سے حضرت علیؑ خود اپنی جانب سے نامہ و پیام اور گفتگوئے صلح کی ابتدا کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح معاملہ طے ہو جائے۔

آپ نے تین آدمیوں کو بطور وفد منتخب کیا۔ بشیر بن عمرو بن محصن انصاری سعید بن قیس ہمدانی، شبث بن ربعی تمیمی اور ان لوگوں کو معاویہ سے گفتگو کے لیے روانہ کیا۔ فرمایا جاؤ۔ اور دعوت دو اتفاق و اتحاد اور اطاعت و اجتماع کی طرف۔
یہ لوگ گئے مگر جواب کیا ملا؟ یہ کہ پلٹ جاؤ، میرے پاس سے، کیونکہ میرے تمہارے درمیان بس تلوار فیصلہ کن ثابت ہو گی۔ (طبری ج ۵ ص ۲۴۳)

یہ اس نفسیاتی حقیقت کا ثبوت ہے کہ جب طرفِ مقابل بلند ظرف نہ ہو تو روادارانہ طرزِ عمل سے وہ یہ خیال کرتا ہے کہ ہمارا مقابل دب گیا ہے اس لیے تشدّد میں اضافہ کر دیتا ہے۔

اب جنگ کا دن آیا۔ صف آرائی ہوئی۔ اور طرفین کی فوجیں باہمدگر مقابل ہوئیں۔ مگر امیرالمومنینؑ کی یہ تاکید ہے کہ ہماری طرف سے جنگ شروع نہ ہو۔ جب اس طرف سے حملہ کی ابتدا ہو گئی اور جنگ ہونے لگی جس کا سلسلہ طویل عرصہ تک قائم رہا۔ اس درمیان میں بھی حضرتؑ کی طرف سے موعظہ و ہدایت اور نصیحت و فہمائش کا سلسلہ جاری رہا جس کا کوئی نتیجہ ظاہر نہ ہوا، آخر سب سے آخری لڑائی ہوئی لیلۃ الہریر میں جو دن رات جاری رہی صبح ہوتے ہوتے شام کی فوج کا ستھراؤ ہو گیا۔ اور بقیہ جماعت کے قدم اٹھ چلے اور اب حاکم شام کو ضرورت محسوس ہوئی کہ جنگ موقوف کی جائے تاکہ وہ انتہائی شکست جس کی توقع بہت قریب تھی ہونے نہ پائے۔

اس کے لیے قرآن نیزوں پر بلند کیا گیا اور آواز دی گئی کہ ھٰذا کتاب اللّٰہ عزّ وجلّ بیننا وبینکم من لثغور اھل الشام بعد اھل الشام ومن لثغور اھل العراق بعد اھل العراق۔

بھائیو! یہ کتاب خدا ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی۔ شام والے سب ہلاک ہو گئے۔ پھر شام کے حدود کی کون حفاظت کرے گا اور عراق والے بھی ہلاک ہو گئے، پھر عراق کے حدود کا کون مالک ہو گا؟[1]

امیرالمومنینؑ پہلے ہی کتاب خدا کی طرف دعوت دے چکے تھے جیسا کہ آپ کی اس تقریر میں ہے جو آپ نے نمائندگانِ شام حبیب بن مسلم فہری و شرجیل بن سمط و معن بن یزید بن اخنس کے سامنے فرمائی تھی۔ اس میں آپ نے کہا تھا۔ الا انی

---

[1] طبری جلد ۶ ص ۲۶

ادعوکم الی کتاب اللہ عزّ وجل و سنّۃ نبیّہ و اماتۃ الباطل واحیاء معالم الدین۔

"میں تم لوگوں کو دعوت دیتا ہوں کتابِ خدا اور سنتِ رسولؐ اور باطل کو پامال کرنے اور حق کو زندہ کرنے کی جانب[1]"

لیکن اس وقت آپ کی یہ دعوت مسترد کر دی گئی۔ اب جس وقت کہ جنگ کا آخری نتیجہ اپنی بھیانک شکل میں اہلِ شام کے سامنے ہے تو اب وہ کتاب خدا کی طرف دعوت کی آواز بلند کرتے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ نہ اس میں سچائی ہے اور نہ حقانیت۔

اس لیے امیر المومنینؑ کا اس وقت خوشی کے ساتھ اس دعوت کو منظور کر لینا اور جنگ کو اس آخری فیصلہ کن نتیجہ کے قریب پہنچ کر ختم کر دینا دشمن کے ہاتھ سے بیوقوف بن جانا ہو جاتا۔ اس لیے حضرتؑ نے اس بے وقت کی تحریکِ التوائے جنگ پر رضامندی ظاہر نہ فرمائی مگر کوفہ کی منافق جماعت نے جو آپ کے لشکر میں داخل تھی فتنہ و فساد برپا کر دیا اور کہا کہ ہم قرآن کے سامنے کسی طرح ہاتھ نہ اٹھائیں گے اور قرآن نیزوں پر بلند ہو جانے کے بعد کسی طرح جنگ نہ ہونے دیں گے۔

امیر المومنینؑ نے دیکھا کہ اب ایک دوسرا فتنہ کھڑا ہو رہا ہے اس لیے آپ نے سکوت اختیار کیا اور جنگ ملتوی ہو گئی۔ دو شخص طرفین کی جانب سے حکم مقرر کیے جانے لگے کہ وہ قرآن مجید پر نظر ڈال کر حقیقت کا فیصلہ کریں۔

شام کے لوگوں نے عمرو بن عاص کو تجویز کیا۔ بلاشبہ انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ امیر المومنینؑ کو حق دیا جاتا کہ کسی ایسے شخص کو معین فرمائیں جس پر آپ کو کامل اعتماد ہو۔ چنانچہ آپ نے اپنی جانب سے عبداللہ بن عباس اور پھر مالک بن اشتر کا نام پیش

---

[1] طبری جلد ۶ صفحہ ۲۔

فرمایا۔ مگر بے انصاف ساتھ والے افراد نے کہا کہ یہ لوگ تو آپ کے ساتھ "یک جان و دو قالب" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم ہرگز ایسے اشخاص کو حکم بنانے پر تیار نہیں بلکہ ابو موسیٰ اشعری کو حکم بنائیں گے۔ جو جنگ کے معاملہ میں غیر جانبدار رہے ہیں۔ حضرتؑ نے انتہائی کبیدگی سے فرمایا کہ "اچھا جو تمھارا جی چاہے کرو مجھ سے مطلب نہیں۔"

صلح نامہ لکھا جانے لگا۔ حدیبیہ کے واقعہ کی یاد یازہ ہو گئی۔ اس طرح کہ جب امیر المومنینؑ صلح نامہ کے شروع میں لکھوانے لگے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ھذا ما تقاضی علیہ علی امیر المؤمنین۔

"یہ وہ ہے جس پر صلح کی علی امیر المومنینؑ نے" تو عمرو بن عاص نے کاتب سے کہا :

"اکتب اسمہ واسم ابیہ ھو امیرکم فاما امیرنا فلا ۔

ان کا اور ان کے باپ کا بس نام لکھو۔ وہ تمھارے امیر ہوں گے، ہم نے انھیں امیر تھوڑا ہی تسلیم کیا ہے۔" اس کی وجہ سے صلح میں تعطل پیدا ہونے ہی والا تھا کہ حضرت علیؑ نے اپنے پیش رو حضرت پیغمبر خداؐ کی تاسی میں فرمایا کہ "امیر المومنین کا لفظ محو کر دو۔ اور کہا۔ اللہ اکبر سنۃ بسنتہ ومثل بمثل واللہ انی لکاتب بین یدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم الحدیبیۃ اذ قالوا لست رسول اللہ ولا نشھد لک بہ ولکن اکتب اسمک واسم ابیک فکتبتہ ۔

"اللہ اکبر! یہی واقعہ ہو بہو پہلے بھی پیش ہو چکا ہے حدیبیہ میں کہ رسالت مآبؐ کے سامنے صلح نامہ لکھ رہا تھا۔ جب ان لوگوں نے کہا کہ ہم آپ کے "رسول اللہ" ہونے کو تسلیم نہیں کرتے۔ لہذا آپ بس اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھیے حضرت نے یہی لکھوایا اور "رسول اللہ" تحریر نہیں کیا۔

اس کے بعد لکھا گیا کہ :

"علی بن ابی طالبؑ ذمہ داری لیتے ہیں، اہل کوفہ اور دیگر ان لوگوں کی

جو ان کے ساتھ ہیں مسلمانوں میں سے اور معاویہ نے
ذمہ داری لی ہے۔ اہل شام اور دیگر ان اشخاص کی جو ان کی طرف ہیں اس۔
قرارداد کے اوپر کہ ہم خدا اور اس کی کتاب پر دارومدار رکھتے ہیں اور سوائے کتابِ
خدا کے کوئی شے ہم میں فیصلہ کن نہیں ہے۔ اور خدا کی کتاب ہمارے
سامنے رہے گی، شروع سے لے کر آخر تک۔ ہم زندہ کریں گے اسی
بات کو جسے کتابِ خدا زندہ کرے۔ اور مردہ کریں گے اُس کو جسے
کتابِ خدا مردہ کرے۔ طرفین کے حکم کتابِ خدا پر نظر ڈالیں گے اور
جو کچھ کتابِ خدا سے ثابت ہوا اس پر عمل کریں گے۔ اور اگر بعد
بحث و تذکرہ اور تبادلۂ خیالات، کتابِ خدا میں کچھ نظر نہ آئے تو
رسالت مآبؐ کی متفقہ سنت پر جس میں اختلاف و افتراق نہ ہو عمل
کیا جائے گا۔"

اس کے بعد دوسرے جزئی شرائط لکھے گئے جو امن و امان اور اجتماعِ حکمین
وغیرہ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ اس معاہدہ سے صاف ظاہر ہے کہ حضرتؑ نے
حقیقتاً "کتابِ الٰہی کو حکم قرار دیا تھا اور یہ کوئی تازہ بات نہ تھی جس کے آپ اس
اس تحریر کی وجہ سے پابند ہوئے ہوں۔ بلکہ ہر وقت ہی آپ کتابِ خدا کے
فیصلہ کے لیے تیار تھے۔

حکمین کا ذاتی فیصلہ جو کتابِ خدا کی بنیاد پر نہ ہو کسی طرح اس قرار دادِ صلح کی
رو سے جائز نہیں سمجھا جا سکتا۔ چنانچہ آپ نے خود حکمین سے جو فیصلہ کے لیے مقرر
ہوئے تھے، صاف طور سے ارشاد فرمایا تھا۔ احکما علیٰ ان تحکما بکتاب
اللہ وکتاب اللہ کلہ معی فان لم تحکما بکتاب اللہ
فلا حکومۃ لکما۔

"تم حکم ہو، مگر اس شرط سے کہ کتاب اللہ کی رو سے فیصلہ کرنا اور
یہ یقینی ہے کہ کتابِ خدا کُل کی کُل میرے ساتھ ہے۔ اگر تم کتابِ خدا کی

رو سے فیصلہ نہ کرو تو تمھاری حکومت تسلیم نہیں ہو سکتی۔"
(اسد الغابہ، ابن اثیر جزری، ج ۳ ص ۲۴۶)

یہی وہ پہلو تھا جس سے یہ "رواداری دامن پسندی" حق پروری اور حمایتِ باطل سے علیحدگی" کے اصول سے ٹکراتی نہ تھی۔ مگر تمام طبیعتیں اس سے راضی ہو تیں نا ممکن۔

ایک جماعت ایسی تھی جو اسی وقت برافروختہ ہوگئی اور کہا یہ صلح ذلّت کی صلح ہے معلوم ہوتا ہے کہ علی بن ابی طالبؑ خود اپنی حقیقت میں شک رکھتے ہیں لا حکم الا اللہ " حاکم سوائے خدا کے کوئی نہیں "
اسی بنیاد پر خوارج کے مذہب کی عمارت قائم ہوئی۔

صلح ہونا، مخالفت ہونا، لوگوں کے دلوں میں شک پیدا ہونا، یہ تمام پرانی ہی باتیں ہیں۔ جو حدیبیہ میں ہمارے سامنے آچکی ہیں وہی یہاں بھی پیش ہوئیں۔
جس طرح وہاں رسالت مآبؐ نے خلاف ورزی معاہدہ سے یہ کہہ کر انکار فرمایا تھا کہ ہم نے عہد کیا ہے اس کی مخالفت نہیں کریں گے اسی طرح امیر المومنینؑ کا جواب تھا۔ چنانچہ زرعۃ بن برج طائی اور حرقوص بن زہیر سعدی سے فرمایا:

قد کتبنا بیننا و بینھم کتابا و شرطنا شروطا واعطینا علیھا عھودنا و مواثیقنا و قد قال اللہ عز و جل و اوفوا بعھد اللہ اذا عاھدتم ولا تنقضوا الایمان بعد توکیدھا وقد جعلتم اللہ علیکم کفیلا ان اللہ یعلم ما تفعلون۔

"ہم نے نوشتہ دے دیا ہے، شرائط قرار دیے ہیں، عہد و میثاق کر لیا ہے۔ اب اس کی مخالفت ممکن نہیں ہے خداوندِ عالم

ارشاد فرماتا ہے، وفا کرو عہد و پیمان کے ساتھ اور نہ توڑو اپنی قسم کو جب کہ تم نے اسے مضبوط کر دیا ہے اور خدا کو اس کا ضامن بنا دیا ہے۔ اور یقیناً خدا تمہارے افعال و اعمال پر مطلع ہے"۔

لیکن اس کے بعد صورتِ حال کیا نمایاں ہوئی ؟ یہ کہ حکمین کے فیصلہ کو جس معیار پر مبنی قرار دیا گیا تھا وہ نہیں ہوا۔ نہ کتاب خدا سے کوئی مطلب رکھا گیا نہ اس میں نظر و فکر کی ضرورت سمجھی گئی۔ بلکہ حکمین نے خود آپس میں ایک سمجھوتہ کر کے اس پر متفق ہونے کی سازش کی اور پھر وہ بھی ناکام رہی اور اختلاف کا اختلاف ہی قائم رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ ابو موسیٰ بھولے بھالے آدمی تھے۔ اور امیر المومنینؑ سے کوئی خاص خلوص بھی نہ رکھتے تھے، اور عمرو عاص سمجھدار چالاک جہاندار و آزمودہ کار اور پھر معاویہ کے خیر خواہ اور وفادار بلکہ روح رواں اور یک جان و دو قالب۔ جب زمانہ حکمین کے اجتماع کا قریب پہنچا تو ابو موسیٰ اشعری اور عمرو بن عاص دونوں آدمی مقام دومۃ الجندل میں جو کوفہ و شام کے درمیان بالکل وسط میں واقع تھا، اور یہیں اجتماع کی قرارداد ہوئی تھی مجتمع ہو گئے۔ روزانہ ملاقات اور تبادلہ خیالات کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ عمرو نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب گفتگو ہو تو ابو موسیٰ اشعری کو اپنے اوپر مقدم قرار دیں اور یہ کہیں کہ آپ بزرگ ہیں اور رسالت مآبؐ کی صحابیت کا مجھ سے زیادہ شرف رکھتے ہیں۔ آپ پہلے تقریر کیجئے پھر میں کہوں گا۔

اسی طرح عمرو عاص نے ابو موسیٰ اشعری پر اپنی ادب شناسی کا اثر قائم کیا اور اپنے خلوص و محبت کا اظہار کیا۔ مسئلہ متنازع فیہ کے متعلق تبادلۂ خیالات ہوا اور رائے یہ قرار دی گئی کہ دونوں طرف کے حکم دونوں طرف کے امیروں کو معزول کر دیں یعنی معاویہ تختِ شام سے اور امیر المومنینؑ تختِ عراق و حجاز سے، دونوں شخص علیحدہ ہو جائیں اور پھر مسلمانوں کو اختیار دیا جائے کہ

وہ از سرِ نو جس شخص کو چاہیں منتخب کر لیں۔"

ابو موسیٰ اور عمرو عاص نے اس رائے کو آپس میں مشورہ کر کے طے کیا اور جب فیصلہ کا وقت آیا اور طرفین کے لوگ فیصلہ سننے کو مجتمع ہوئے۔ عمرو عاص نے حسب عادت ابو موسیٰ اشعری سے کہا۔ "بسم اللہ فرمائیے جو کچھ آپ کی رائے ہے"۔ ابو موسیٰ کی عادت تو پہلے سے پڑی ہوئی تھی ہی، تقریر کے لیے آمادہ ہو گئے اور خیال نہ کیا کہ اس میں کوئی بات نہ ہو۔ باوجودیکہ عبداللہ بن عباس جو سمجھدار شخص تھے انھوں نے ابو موسیٰ سے کہا کہ دیکھو عمرو عاص نے تمھیں کہیں فریب نہ دیا ہو۔ پہلے عمرو عاص کو تقریر کر لینے دو پھر تم تقریر کرنا، مگر ابو موسیٰ نے کہا کہ نہیں ہم متفق ہو چکے ہیں اور کوئی اختلاف نہیں ہے"۔ اس کے بعد کھڑے ہو گئے اور حمد و ثنا، کے بعد کہنے لگے کہ "ہم نے انتہائی غور و خوض کے بعد بہترین رائے جو قرار دی ہے جس میں افتراق و اختلاف کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم دونوں آدمی، علیؑ و معاویہ دونوں کو معزول کر دیں اور مسئلہ خلافت کو از سرِ نو مسلمانوں کے انتخاب کے حوالہ کر دیں کہ جسے وہ چاہیں منتخب کر لیں"۔

ابو موسیٰ نے یہ تقریر کی اور بیٹھ گئے۔ عمرو عاص کی باری آئی، وہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے۔

"حضرات! آپ لوگوں نے ابو موسیٰ کی تقریر سنی، انھوں نے نمائندہ علیؑ ہونے کی حیثیت سے علیؑ کو معزول کر دیا۔ میں حاکمِ شام کا نمائندہ ہوں، میں بھی علیؑ کی معزولی سے متفق ہوں، مگر حاکمِ شام کو برقرار رکھتا ہوں"۔

ابو موسیٰ برافروختہ ہو گئے، کہنے لگے:

"ما لك لا وفقك الله غدرت وفجرت انما مثلك كمثل الكلب ان تحمل عليه يلهث او تتركه يلهث۔

"یہ تو نے کیا کیا؟ خدا تجھ سے سمجھے، تو نے غداری کی، بے ایمانی کی۔ تو کتّے کی طرح ہے کہ چاہے اس پر حملہ کرو اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ وہ بھونکنے سے باز نہ آئے گا۔"

عمرو عاص نے جواب دیا۔

انما مثلك كمثل الحمار يحمل اسفارا۔

"تمھاری مثال گدھے کی ہے جس کی پشت پر کتابیں لاد دی گئی ہوں"۔

جلسہ انہی تہذیب و اخلاق کے مظاہروں پر ختم ہوگیا۔ قریب تھا کہ کشت و خون کی نوبت آجائے لیکن غنیمت یہ ہے کہ مجمع اسی افتراق و پراگندگی کے ساتھ منتشر ہوگیا اور زبانی جنگ سے آگے نہیں بڑھا۔

قرار داد یہ تھی کہ کتابِ خدا پر نظر ڈالی جائے گی۔ بحث وتمحیص کے بعد جس بات پر دونوں طرف کے حکم متفق ہوں گے وہ عمل میں لائی جائے گی۔ مگر اتفاق کی صورت پیدا ہی نہیں ہوئی۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں کوئی بھی فریق اس فیصلہ کو جائز نہیں سمجھتا ہے اور شیعہ ہوں یا سنی کوئی مخالف نہیں ہے۔ سب ہی کہتے ہیں کہ فیصلہ کھلونا بن کر رہ گیا۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ حضرات اہل سنّت معاویہ کی خلافت کا امام حسنؑ کی صلح سے حساب کرتے ہیں۔ اس سے قبل نہیں سمجھتے۔ حالانکہ اگر یہ فیصلہ ناطق ہوتا تو اسی وقت سے خلافتِ معاویہ تسلیم کرلی جاتی۔

اس صورتِ حال کے معنی یہ تھے کہ معاہدہ کے دفعات پامال ہوگئے اور قرار دادِ صلح کے حدود ختم ہوگئے، اس لیے امیرالمومنینؑ پھر جنگ پر آمادہ ہوئے اور فوج کو حکم دیا۔

بہرحال وہی طرزِ عمل کہ کبھی صلح اور کبھی جنگ، جنگ کا موقع ہوتا ہے تو ہمت وجرأت سب کا مظاہرہ اعلیٰ شان سے۔ اور صلح کا موقع ہوتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بازوؤں میں طاقت اور دل میں جوش پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔
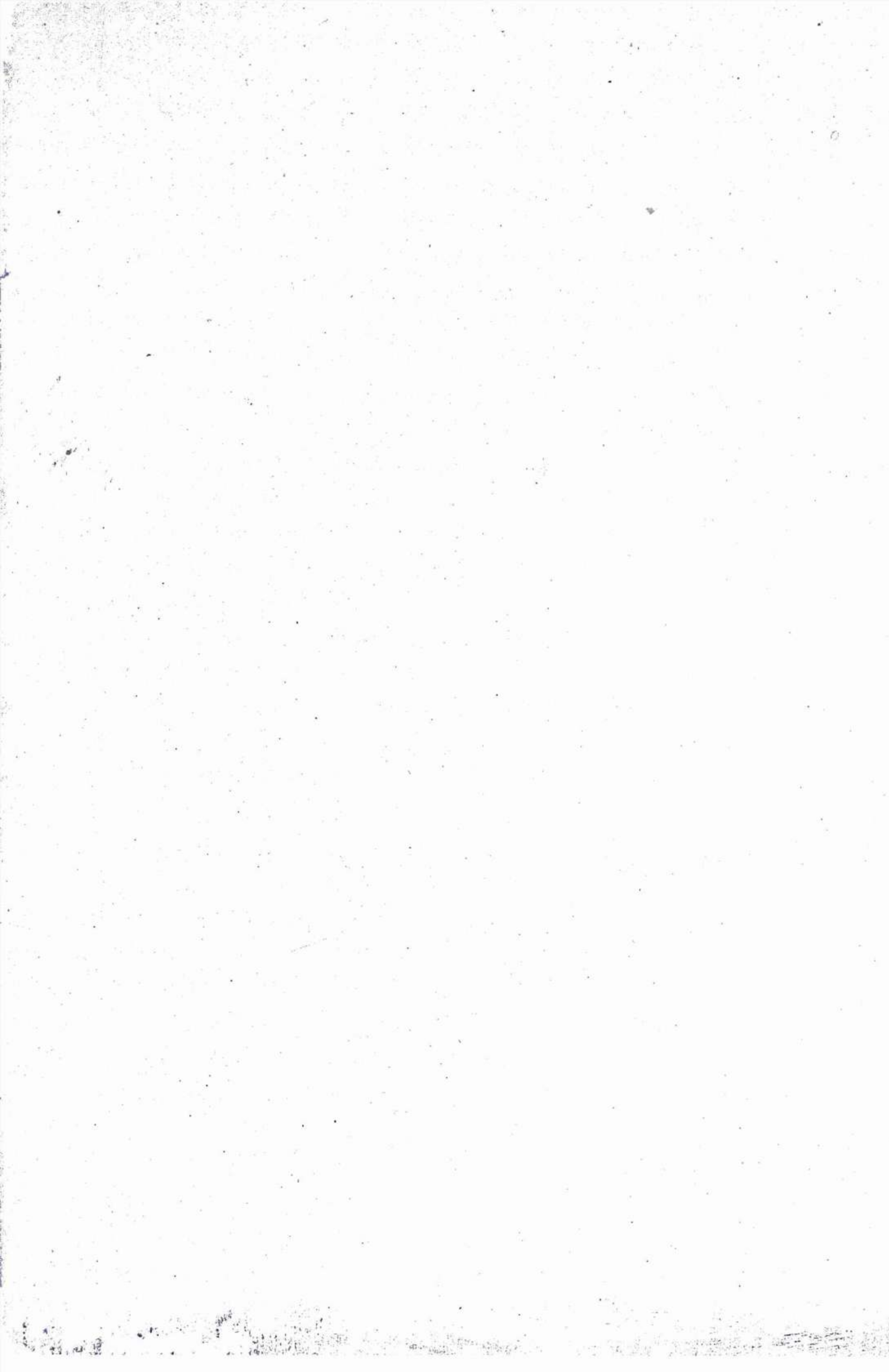
فرزندِ رسولؐ حضرت امام حسنِ مجتبیٰؑ

امن پسندی راو داری کے ساتھ حق کی حمایت

کا اعلیٰ مظاہرہ

رسولؐ کا زمانہ گذر گیا۔ امیر المومنینؑ کا دور بھی ختم ہوا۔ اب وقت ہے فرزندانِ رسولؐ یعنی امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا۔ امام حسنؑ نے دیکھا کہ مسلمانوں کا خون بہت بہ چکا ہے معاملات حد سے زیادہ طول پکڑ چکے ہیں اور پیمانۂ تحمل لبریز ہو چکا ہے۔ مسلمانوں میں اب اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ اب زیادہ زمانہ تک خونریزی کے نتائج کو برداشت کریں آپ نے صلح کی۔ صلح کے شرائط قرار پائے اور میں ان شرائط صلح کو یہ دکھلانے کے لیے پیش کرنا ضروری سمجھوں گا کہ آپ نے امن پسندی کے مقصد کے لیے حمایتِ باطل سے علیحدگی کے پہلو کو ترک نہیں کر دیا تھا۔ بلکہ اس پہلو کی کامل حفاظت فرمائی ہے۔

یہ امام حسنؑ کا طرزِ عمل یعنی صلح ایسا ہے کہ موجودہ زمانہ کے تمام مسلمان اس کے حق بجانب ہونے پر متفق ہیں۔ شیعہ! وہ تو بہرحال یہ کہتے ہیں کہ امامؑ کا طرزِ عمل ہے، لہٰذا وہ حق بجانب ہے۔

معصوم سے کسی غلطی کا ہونا ممکن نہیں۔ آپ نے صلح کی تو موقع تھا صلح کا جب ہی صلح فرمائی۔ حضرات اہلِ سنّت بھی اس امر سے اتفاق رکھتے ہیں اور جوامع حدیث میں ایک حدیث کی روایت کرتے ہیں۔ امام حسنؑ کے متعلق کہ حضرت رسولؐ نے فرمایا تھا۔ ابنی ھذا سید یصلح اللہ بہ بین فئتین من المسلمین

"یہ میرا بیٹا سید و سردار ہے خدا اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کی دو جماعتوں میں صلح کرائے گا۔"

لیکن یہ موجودہ زمانہ کے مسلمان ہیں جو اس صلح کی پسندیدگی پر اتفاق رکھتے ہیں۔ مگر اس زمانہ میں کہ جب صلح واقع ہوئی تھی وہی صورتیں نظر آ رہی تھیں جو رسالت مآبؐ کی صلح میں پیش آئیں اور امیر المومنینؑ کی صلح میں رونما ہوئیں۔

ایک بہت بڑی جماعت خلاف ہو گئی اور اس نے کہا کہ آپ نے کمزوری سے صلح کر لی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ آپ کو السلام علیک یا مذل المومنین کے الفاظ سے سلام کیا گیا۔

جس طرح رسالت مآبؐ سے کہا گیا۔ "الست رسول اللہ۔ فلم نعطی الدنیۃ فی دیننا۔" کیا آپ خدا کے رسول نہیں ہیں۔ پھر آخر ہم اپنے مذہب کی ذلت کو کس لیے برداشت کریں۔

رسولؐ کی صلح کو اسلام اور مسلمانوں کی ذلت قرار دیا جا رہا تھا، اسی طرح حسن مجتبیٰؑ کی صلح کو تمام مسلمانوں کی ذلت سے تعبیر کیا گیا۔ اور یہ کہا گیا کہ:

"سلام ہو آپ پر اے تمام مومنین کے باعث ذلت ہونے والے"

لیکن وہ رواداری کی طاقت تھی کہ ان تمام باتوں پر بھی کچھ اعتناء نہ کی، ان تمام چیزوں کو برداشت کیا، لیکن صلح پسندی سے نہ ہٹے۔

بے شک شرائط صلح میں اس بات کا خیال رکھا کہ حمایتِ باطل کا پہلو بھی پیدا نہ ہو اور ضلالت و گمراہی کی اشاعت کی بھی اپنے اوپر ذمہ داری نہ عائد ہو۔

صواعق محرقہ علامہ ابن حجر مکی[1] میں جو صلح نامہ کا مضمون درج ہے، وہ حسب ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ھذا ما صالح علیہ الحسن

---

[1] مطبوعہ مصر ص۸۳

بن علی معاویۃ بن ابی سفیان صالحہ علی ان یسلم الیہ ولایۃ المسلمین (شیعوں کے عقیدہ میں "امامت" جو چیز ہے وہ نفسانی صفات کا نتیجہ اور خدا کی طرف کا منصب ہے۔ وہ انسان کے ساتھ خدا کی مخصوص کی ہوئی ایک بات ہے جو الگ نہیں کی جا سکتی۔ ایک عالم کا علم جس طرح اس قابل نہیں کہ بیع ہو سکے، شراء ہو سکے اور ایک نبی کی نبوت، رسول کی رسالت بیع و شراء کی صلاحیت نہیں رکھتی اسی طرح امامت ایک نفسانی حیثیت رکھتی ہے، وہ قابلِ انتقال نہیں ہے۔ اور نہ عہد یا صلح کے ذریعے سے وہ ایک سے دوسرے کی طرف جا سکتی ہے بے شک ظاہری حکومت، وہ امامت سے جداگانہ چیز ہے جو امامت کی بنا پر ایک امام کا حق ہے، یہ حق منتقل بھی ہو سکتا ہے اور اس کے متعلق عہد و صلح، پیمان و قرار داد کا موقع بھی ہے، اس کا رہنا یا منتقل ہو جانا امامت میں کسی تفریق کا باعث نہیں ہے۔ جس طرح ظاہری سلطنت کی موجودگی میں امام، امام ہے اسی طرح سلطنت سے علیحدہ ہونے پر بھی امام کی امامت باقی ہے)۔

"صلح یہ ہو رہی ہے کہ حسنؑ بن علیؑ مسلمانوں کی حکومت کو معاویہ بن ابی سفیان کے سپرد کر دیں۔"

لیکن سپردگی یونہی نہ کریں۔ اس لیے کہ حمایتِ باطل کرنا منظور نہیں، اس لیے یہ شرط قرار دی گئی کہ علی ان یعمل فیہا بکتاب اللہ تعالیٰ وسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسیرۃ الخلفاء الراشدین المہدیین ولیس لمعاویۃ بن ابی سفیان ان یعہد الی احد من بعدہ عہدا بل یکون الامر من بعدہ شوریٰ بین المسلمین وعلی ان الناس امنون حیث کانوا من ارض اللہ تعالیٰ فی شامہم وعراقہم وحجازہم ویمنہم وعلی ان اصحاب علی وشیعتہ امنون علی انفسہم واموالہم ونساءہم

واولادهم حيث كانوا وعلى معاوية بن ابى سفيان بذالك عهد الله وميثاقه وان لا يبتغى للحسن بن على ولا لاخيه الحسين ولا لاحد من بيت رسول الله صلى الله عليه وسلم غائلة سرا ولا جهرا ولا يخيف احدا منهم فى افق من الافاق۔

"اس شرط پر کہ معاویہ مسلمانوں کے درمیان کتابِ خدا پر عمل کریں اور سنتِ رسول اللہؐ کا اجراء کریں اور صحیح راستہ پر چلنے والے ہدایت یافتہ خلفاء کی جو سیرت ہونا چاہیئے اس کے پابند رہیں اور معاویہ کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ اپنے بعد کسی کو بھی جانشینی کے لیے نامزد کریں اور ولی عہد قرار دیں بلکہ یہ امر ان کے بعد مسلمانوں کے شوریٰ پر موقوف ہوگا۔ اور یہ کہ تمام لوگ امن وامان میں رہیں گے۔ شام، حجاز، عراق، یمن، جس جگہ بھی خدا کی زمین میں وہ بس گئے ہوں، اور علیؑ کے اصحاب اور ان کے شیعہ بھی اپنے جان، مال، ناموس، اولاد ہر حیثیت سے مامون ومحفوظ رکھے جائیں گے جس جگہ بھی ان کا قیام ہو۔ یہ عہد ہے جو خدا کی طرف سے معاویہ کے اوپر عائد ہے اور معاویہ کسی وقت میں بھی امام حسنؑ یا ان کے بھائی امام حسینؑ یا اہل بیتؑ رسولؐ میں سے کسی اور شخص کے قتل کی ریشہ دوانی نہ کریں گے۔ خفیہ طور سے اور نہ علانیہ اور نہ کسی وقت میں ان کو قتل کی دھمکی دیں گے۔ اور نہ خوف ودہشت کا باعث ہوں گے۔"

یہ تھے شرائطِ صلح جن پر طرفین کا اتفاق ہوا۔

جس طرح امام حسنؑ اس صلح پر رضامند تھے، اسی طرح آپ کے چھوٹے بھائی امام حسینؑ بھی اس سے متفق تھے اور ان کی رائے بھی حالاتِ وقت کو دیکھتے ہوئے امام حسنؑ کی رائے سے متحد تھی شیعوں کے عقائد کے لحاظ سے

تو معصومین کی آراء میں اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن میں تو تاریخی حیثیت سے کلام کر رہا ہوں۔ اس حیثیت سے بھی یہ حقیقت ثابت ہے کہ امام حسنؑ نے جو صلح کی ہے تو امام حسینؑ بھی اس سے متفق تھے۔

چنانچہ میرے پیش نظر ہے: تاریخ "الاخبار الطوال" یہ ابو حنیفہ احمد بن داؤد دنیوری کی تصنیف ہے۔ جن کی وفات ۲۸۱ھ میں ہوئی ہے۔ یہ طبری کے معاصر اور ایک حیثیت سے ان سے مقدم ہیں۔ اس لیے طبری کی وفات ۳۱۰ھ میں ہے۔

یہ تاریخ مصر میں چھپی ہے اور وہاں کے جامع ازہر کے مدرس علم تاریخ شیخ محمد خضری مشہور مصنف تاریخ خضری کے حواشی اور توضیحات کے ساتھ ۱۳۳۰ھ میں طبع ہوئی ہے۔

یہ کتاب میرے سامنے ہے اور اس میں لکھا ہے کہ حجر بن عدی اور عبیدہ بن عمر جو صلحِ امام حسنؑ کے مسئلہ میں اختلاف رکھتے تھے امام حسینؑ کے پاس آئے اور کہا:

"ابا عبد اللہ شریتم الذّل بالعزّ وقبلتم القلیل وترکتم الکثیر اطعنا الیوم واعصنا الدھر دع الحسن وما رأی من ھذا الصلح واجمع الیک شیعتک من اھل الکوفۃ وغیرھا وولنی وصاحبی ھذہ المقدمۃ فلا یشعر ابن ھند الّا ونحن نقارعہ السیوف"

دیکھئے وہ ایسے الفاظ میں گفتگو کر رہے ہیں جو ہر ایسے انسان کے جوش کو موجزن کر دیں جس کے اقدامات جذبات کے ماتحت ہوتے ہوں۔ وہ کہتے ہیں۔ "اے ابو عبد اللہ آپ لوگوں نے عزت کے بدلے میں ذلت کو خرید لیا۔ آپ نے کم حقوق حاصل کر کے بہت سے اپنے حقوق سے دست کشی کر

لی۔ اب آپ آج ہماری بات مان لیجئے چاہے پھر کبھی نہ مانیئے گا۔ آپ امام حسنؑ کو چھوڑ دیجئے، صلح پسندی کے اس مسلک کی بنا پر جو انھوں نے اختیار کیا ہے۔ لیکن آپ اپنے ساتھیوں کو جمع کیجئے جو کوفہ میں ہیں یا کوفہ کے باہر اور ہم دونوں آدمیوں کو مقدمۃ الجیش کا افسر بنا دیجیے۔ بس حاکم شام کو خبر بھی نہ ہو کہ ہم تلواروں سے حملے کرتے ہوئے نظر آئیں۔

حضرتؑ نے فرمایا یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم عہد کر چکے قول و قرار کر چکے اب عہد شکنی ممکن نہیں اور ملاحظہ ہو علی بن محمد بن بشیر ہمدانی یہ بھی اسی جماعت میں سے ہیں جو صلح پر معترض تھی۔ ان کا بیان ہے کہ میں سفیان بن ابی لیلی کی معیت میں مدینہ پہنچا اور امام حسنؑ کے پاس ملنے گیا۔ آپ کے پاس اس وقت مسیب بن نجبہ، عبداللہ بن وداک تمیمی اور سراج بن مالک خثعمی موجود تھے۔

میں نے کہا السلام علیك یا مذل المومنین۔ آپ نے اس طرح کے سلام کا جواب بھی ضروری سمجھا اور فرمایا۔ وعلیك السلام اجلس لست مذل المؤمنین ولکنی معزهم ما اردت بمصالحتی معاویة الا ان ادفع عنکم القتل عند ما رائیت من تباطئ اصحابی عن الحرب ونکولهم عن القتال واللہ لئن سرنا الیه بالجبال والشجر ما کان بد من افضاء هذا الامر الیه۔

"تم پر بھی سلام ہو، بیٹھو، میں مومنین کی ذلت کا باعث ہونے والا نہیں ہوں میں تو ان کی عزت کا خواہاں ہوں، مجھے تو اس صلح سے یہ منظور تھا کہ خونریزی کا انسداد ہو اور قتل کا سلسلہ موقوف ہو، جب کہ میں نے دیکھا کہ اب جنگ کا جوش و ولولہ باقی نہیں رہا ہے۔ اور جنگ میں کمزوری ہونے لگی ہے۔ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ اگر جنگ آئندہ بھی جاری رکھی گئی تب بھی نتیجہ میں ایک دن معاویہ کی بادشاہت قائم ضرور ہو جائے گی۔"

یہ حضرتؑ نے اپنے مخاطب کی مذاقِ طبیعت کے موافق کلام فرمایا۔ اب

یہ لوگ حضرت کے پاس سے اٹھ کر امام حسینؑ کے پاس گئے اور حضرتؑ سے پوری گفتگو امام حسنؑ کی بیان کی حضرتؑ نے فرمایا۔ صدق ابو محمد فلیکن کل رجل منکم حلسامن احلاس بیتہ مادام ھٰذا الانسان حیاً۔"

"سچ کہا ابو محمد (حضرت حسنؑ) نے تمھیں لازم ہے کہ ہر شخص تم میں سے اس طرح گھر میں بیٹھ جائے جس طرح وہ فرش جو سب سے نیچے بچھایا جاتا ہے۔ جیسے چٹائی جو بدلی نہیں جاتی اور اٹھتی نہیں ہے اس وقت تک کہ جب تک یہ شخص یعنی حاکم شام معاویہ زندہ رہے۔"

یہ ہیں وہ واقعات جن سے حقیقتِ حال بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے ان لوگوں کا خیال غلط ہے جو یہ کہتے ہیں کہ امام حسینؑ صلح سے راضی نہ تھے۔ آپ کا طرزِ عمل بھی یہی بتلاتا ہے کہ صلح پر آپ نے قیام کیا۔ جنگ کی کوئی تیاری نہیں کی۔

دس برس آپ کو امام حسنؑ کی معیت میں گزرے۔ ان کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ بھائی کے دباؤ سے آپ صلح پر قائم رہے۔ لیکن امام حسنؑ کے بعد بھی دس برس تک آپ خاموش نظر آتے ہیں جبکہ شیعی عقائد کے مطابق امامت آپ کی طرف منتقل ہو چکی تھی۔

امام حسن کی زندگی خاموشی سے گزری، کسی قسم کا تعرض نہیں۔ کوئی جنگ کی صورت نہیں لیکن معاہدہ جو ہوا تھا وہ کہاں تک پایۂ تکمیل کو پہنچا؟ اس پر کس حد تک عمل ہوا؟ اس کو تاریخ کا دیکھنے والا بچہ بچہ خوب جانتا ہے۔

میں اگر تاریخی واقعات کو تفصیل سے پیش کرنا چاہوں تو وقت وفرصت میں گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا مختصر طور سے یہ دکھانا ضروری سمجھتا ہوں کہ شرائطِ صلح جو قرار پائے تھے ان پر عمل نہیں ہوا۔

یہ ایسی باتیں نہیں ہیں جنھیں کوئی کہے اور کوئی انکار کرے بلکہ یہ ایسی حقیقتیں

ہیں جو انکار کے قابل نہیں ہیں۔

پہلی شرط معاہدہ کی یہ ہے کہ ان یعمل فیھا بکتاب اللہ وسنۃ رسول اللہ وسیرۃ الخلفاء الراشدین المھدیین۔ "عمل ہونا چاہیئے کتابِ خدا پر اور رسالت مآبؐ کی سنّت پر اور ایسے خلفاء کی سیرت پر جو راشدین و مہدیین سمجھے جاسکیں"۔

اس پر کہاں تک عمل ہوا اور کہاں تک نہیں ہوا؟ اس کا بیان بہت طویل الذیل ہے۔ میں مختصر طور سے یہ دکھلانا چاہتا ہوں کہ یہ شرط پوری نہیں ہوئی۔ خود شیعوں کا جو عقیدہ ہے وہ تو ہے ہی۔ میں نے اس وقت عقائد شیعہ کی تبلیغ کا ارادہ نہیں کیا ہے۔ اس کے دوسرے مواقع ہیں لیکن عام اسلامی نقطۂ نظر اور اکثریتِ مسلمین یعنی سوادِ اعظم کے زاویہ نگاہ سے یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ جناب رسالت مآبؐ کے بعد صرف تیس برس تک خلافتِ راشدہ کا دور رہا ہے۔ ایک حدیث بھی اس کے متعلق بیان کی جاتی ہے۔ کہ حضرت رسولؐ نے فرمایا۔ ان الخلافۃ بعدی ثلثون سنۃ۔

یہ تیس برس کی مدّت پوری ہو جاتی ہے اس چھ مہینہ تک جس میں امیرالمومنین کی شہادت کے بعد امام حسنؑ سے خلافت کا تعلق رہا ہے اور بس اس کے بعد سے یعنی جب سے کہ آپ نے معاویہ کے ساتھ صلح کر کے خلافت ان کے سپرد کی۔ وہ تیس برس کی مدّت ختم اور خلافت کا زمانہ منقضی ہو گیا۔ بس اس کے بعد ملوکیت ہے۔ جہانبانی ہے، دنیاداری ہے مگر خلافت نہیں ہے۔

غور کے قابل یہ بات ہے کہ اگر یہ شرط پوری ہوئی ہوتی کہ کتابِ خدا، سنتِ رسولؐ اور راشدین و مہدیین خلفاء کی سیرت پر عمل ہو تو معاویہ کی حکومت خلافتِ راشدہ کے حدود سے خارج کیوں قرار پائی۔

عمر بن عبدالعزیزؓ کے متعلق یہ خیال کیا گیا ہے کہ ان کا زمانہ ملحقاتِ خلافت، راشدہ سے ہے۔ مگر فاصلہ ہو جانے کی وجہ سے اس میں محسوب نہیں ہوا۔ کہا جاتا

ہے کہ ان کی سیرت اپنے ہمنام حضرت خلیفہ ثانی کی سیرت سے ملتی جلتی ہے۔ لہٰذا ان کی حکومت راشدہ خلافت کے نام کی مستحق ہے مگر معاویہ کے دورِ حکومت کے متعلق کسی نے یہ رائے ظاہر نہیں کی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ تمام مسلمانوں کے نزدیک اس شرط پر عمل نہیں ہوا تھا۔

پھر اب میں واقعات کا جائزہ لے کر کیا کروں جب کہ ایک صحیح متفقہ علمی فیصلہ میرے سامنے آگیا ہے جس پر تمام مسلمانوں کی مہر تصدیق ثبت ہے۔

دوسری شرط یہ تھی کہ "تمام لوگ امن و امان میں رہیں گے اور صبر و سکون کی فضا میں سانس لے سکیں گے"۔ اس کے متعلق تاریخی کتب کے صفحات انتہائی تاریک مرقع پیش کر رہے ہیں۔

زیاد بن سمیہ کی حکومت عراق میں اور اس کے بعد سے جو واقعات پیش آئے ہیں وہ ایک مختصر وقت میں تذکرہ کے قابل نہیں ہیں۔

حجرؓ بن عدی اور ان کے چھ ساتھی شام میں بلوا کر قتل کر دیے گئے حالانکہ وہ اعلان کر رہے تھے کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہم اپنے معاہدہ پر قائم ہیں اور بغاوت نہیں کر رہے ہیں مگر وہ باوجود اس کے اس عظیم جرم کی بناء پر قتل کر دیے گئے جس کا نام ہے محبتِ اہلِ بیتؑ۔ ان کے متعلق نہ حلم میں کوئی گنجائش تھی نہ رحم و کرم ان پر نگاہ ڈالنے کی اجازت دیتا تھا۔

یہ واقعہ ایسا تھا جس پر تمام عالمِ اسلام نے اظہارِ تاسف کیا اور غم و غصہ کا اظہار کیا۔

یہ حجرؓ بن عدی کون تھے؟ استیعاب میں ہے کان من فضلاء الصحابة یہ صحابۂ کرام کے اندر افاضل میں محسوب ہیں ـــــ کتب فیہ زیاد الی معاویة فامرہ ان یبعث بہ الیہ فبعث الیہ مع وائل بن حجر الحضرمی فی اثنی عشر رجلا کلھم فی الحدید فقتل معاویة منھم ستة واستحیی ستة وکان حجر ممن قتل۔ " ان کے بارے

میں زیاد نے حاکم شام کو شکایت کا خط لکھا حکم دیا گیا کہ ان کو شام کی طرف بھیج دو۔ یہ بارہ آدمی تھے جو لوہے میں جکڑ کر شام کی طرف بھیج دیے گئے۔

معاویہ نے چھ آدمیوں کو قتل کیا اور چھ آدمیوں کو چھوڑ دیا اور حجرؓ بن عدی بھی ان میں تھے کہ جو قتل کیے گئے۔"

اب ان کی ہر دلعزیزی ملاحظہ ہو۔ فبلغ ما صنع بهم زياد الى عائشة فبعثت الى معاوية عبد الرحمٰن بن الحارث بن هشام "زیاد کی مخبری کی اطلاع ام المومنین عائشہؓ کو پہنچی۔ آپ نے عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام کو حسب ذیل پیغام کے ساتھ حاکم شام کے پاس روانہ کیا۔ الله الله فی حجر واصحابه "خدا سے خوف کرنا حجرؓ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں۔" مگر افسوس ہے کہ عبدالرحمٰن اس وقت پہنچے جب حجر اپنے پانچ ساتھیوں کی معیت میں قتل ہو چکے تھے۔ عبدالرحمٰن نے معاویہ سے کہا۔ عزب عنك حلم ابی سفیان فی حجر واصحابه الا حبستهم فی السجون وعرضتهم للطاعون۔ "آپ کے پاس سے کہاں گیا تھا ابو سفیان سے ملا ہوا حلم ؟ آپ نے اس حلم سے کام کیوں نہ لیا ؟ آپ نے ان کو جیل خانے ہی میں قید کر دیا ہوتا اور وبا و طاعون سے ہلاک ہو جانے دیا ہوتا۔"

حاکم شام نے (شاید طنز کے طور پر) جواب دیا۔ حين غاب عنی مثلك من قومی "تمہارا جیسا کوئی مشورہ دینے والا موجود نہ تھا، اس لیے ایسا ہوا۔" عبدالرحمٰن نے کہا، والله لا تعدّ لك العرب حلما بعدها ابدا ولا رأيا قتلت قوما بعث بهم اليك اسارى من المسلمين۔"

"اب بخدا عرب میں نہ تو آپ کے حلم کا کوئی ذکر ہوگا اور نہ آپ کی اصابت رائے قابلِ تسلیم رہی ہے۔ آپ نے ایسے آدمیوں کو قتل کیا جن کو قید کر کے آپ کے

پاس بھیجا گیا تھا اور وہ مسلمان تھے "

جب معاویہ مدینۂ رسولؐ میں آئے اور حضرت عائشہؓ کے پاس سلام کے لیے حاضر ہوئے تو سب سے پہلی بات جو ام المومنینؓ نے پیش کی وہ حجرؓ کا معاملہ تھا اور اس گفتگو میں یہاں تک طول ہوا کہ معاویہ نے اپنی جرأت و دیدہ دلیری سے کہا۔ فدعینی و حجر احتیٰ نلتقی عند ربنا۔

"اچھا پھر چھوڑ دیجئے مجھے اور حجرؓ کو، خدا کے یہاں دیکھا جائے گا"

یہ تھی اہمیت اس قتل کی ام المومنینؓ کی نظر میں حضرت عبداللہؓ بن عمر کا واقعہ ہے کہ آپ بازار میں تشریف رکھتے تھے۔ فنعی الیہ حجر فاطلق حبوتہ و قام وقد غلب النحیب۔ "آپ کو حجرؓ کے قتل کی خبر ملی تو آپ بے چین ہو گئے، نشست کو قائم نہ رکھ سکے اور کھڑے ہو کر چیخیں مار مار کر رونے لگے"

محمد بن سیرین کا بیان ہے کہ جب حجرؓ بن عدی کو سزائے موت سنائی گئی۔ قال دعونی اصلی رکعتین۔ "انھوں نے کہا مجھے اتنی اجازت دو کہ میں دو رکعت نماز پڑھ لوں" اجازت ملی، انھوں نے دو رکعت نماز اختصار کے ساتھ ادا کی۔ اس کے بعد کہا۔ لولا ان تظنوا بی غیر الذی بی لاطلتھما۔ "اگر تم کو یہ خیال نہ پیدا ہوتا کہ میں قتل کے خوف سے نماز میں طول دے رہا ہوں تو میں نماز اتنی جلدی ختم نہ کرتا"

محمد بن سیرین سے سوال کیا جاتا تھا کہ مقتول کو اپنی موت سے پہلے نماز پڑھنا چاہیئے یا نہیں۔ تو وہ جواب دیتے تھے کہ صلاھا خبیب و حجر وھما فاضلان۔ "خبیبؓ اور حجرؓ دونوں آدمیوں نے اپنے قتل کے پہلے دو رکعت نماز پڑھی اور یہ دونوں فاضل شخص تھے"

(اس کے معنی یہ ہیں کہ ان دونوں کا فعل ہمارے لیے سند ہے"

حسن بصری کے متعلق مذکور ہے کہ ان سے معاویہ اور قتل حجرؓ کا تذکرہ ہوا تو

انھوں نے کہا۔ ویل لمن قتل حجر و اصحابہ" وائے ہو اس پر جس نے حجرؓ اور ان کے اصحاب کو قتل کیا۔"

امام احمد بن حنبل نے اپنے استاد یحیٰی بن سلیمان سے دریافت کیا کہ کیا حجرؓ بن عدی مستجاب الدعوہ تھے؟ تو انھوں نے کہا۔ نعم وکان من افاضل اصحاب النبی) "ہاں اور افاضلِ اصحابِ رسولؐ میں سے تھے۔"

ام المومنین عائشہؓ نے جو پیغام بھیجا تھا اور پھر جو زبانی گفتگو حاکم شام سے فرمائی اس کا تذکرہ ہو چکا۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ آپ نے اپنے مقام پر حجرؓ کے قتل کے متعلق کس طرح اظہار خیال کیا۔ آپ نے فرمایا۔

اما واللہ لو علم معاویۃ ان عند اهل الکوفۃ منعۃ ما اجترأ علی ان یاخذ حجرا و اصحابہ من بینھم حتی یقتلھم بالشام ولکن ابن آکلۃ الاکباد علم انہ قد ذھب الناس اما واللہ ان کانوا لجمجمۃ العرب منعۃ و فقھا وللہ در لبید حیث یقول۔

ذھب الذین یعاش فی اکنافھم ولبقیت فی خلف کجلد الاجرب

لاینفعون ولایرجی خیرھم ویعاب قائلھم وان لم یشغب

"اگر معاویہ کو احساس ہوتا کہ اہل کوفہ میں کچھ بھی جرأت وہمت ہے تو وہ کبھی حجرؓ اور ان کے اصحاب کو گرفتار کرنے کی جرأت نہ کرتا کہ شام میں بلوا کر انھیں قتل کرے لیکن جگر خوارہ کے لڑکے کو معلوم تھا کہ آدمی فنا ہو چکے ہیں، خدا کی قسم یہ لوگ اپنی طاقت اور مفتی قابلیت کے لحاظ سے عرب کے سر اور دماغ سمجھے جا سکتے تھے۔ لبیدؓ شاعر نے کیا خوب نظم کیا ہے اپنے اشعار میں جن کا مضمون یہ ہے:

"گزر گئے وہ لوگ جن کی پناہ میں زندگی بسر کی جا سکتی تھی اور رہ

گیا ہوں میں اب ایسے پسماندہ افراد میں جو خارشتی اونٹ کی کھال کے مثل ہیں نہ تو ان کا کوئی فائدہ ہے اور نہ ان سے کسی اچھائی کی توقع ہے، جب وہ بات کرتے ہیں تو عیوب سے مملو، چاہے وہ شور دغل برپا نہ کریں۔"

یہ تھے تاثرات مختلف اکابر اسلام کے حجرؓ بن عدی کے واقعۂ قتل کے اوپر۔ ایک بزرگ تھے ربیع بن زیاد حارثی جو ابن زیاد کی طرف سے خراسان کے حاکم تھے۔ انھیں جب حجرؓ بن عدی کے قتل ہونے کی خبر پہنچی تو انھوں نے کہا:

اللھم ان کان للربیع عندك خیر فاقبضه الیك وعجل

"خداوندا! اگر ربیع کے لیے تیرے نزدیک کچھ بہتری ہے تو جلد اس کی روح کو قبض فرما لے۔ فلم یبرح من مجلسه حتیٰ مات" ابھی اپنی جگہ سے ہٹے نہ تھے کہ روح قبض ہو گئی اور دنیا سے مفارقت کی۔"[1]

جب حاکمِ شام کا مرض الموت شدید ہوا تو عبداللہ بن یزید اسدی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے دیکھا کہ آپ بہت مضطرب ہیں۔ اس نے (خوشامد کے طور پر) کہا کہ آپ کو اضطراب کی کیا ضرورت؟ اگر مر گئے تو جنت میں پہنچے اور اگر زندہ رہے تو مسلمانوں کے جہاں پناہ رہے۔ معاویہ نے کہا خدا تمھارے باپ پر رحمت نازل کرے وہ مجھے حجرؓ بن عدی کے قتل سے منع کر رہے تھے۔"[2]

یہ آخری وقت تھا، کہ جب اپنے طرزِ عمل کا احساس ہو رہا تھا طبری میں لکھا ہے کہ عام طور سے مشہور رہے کہ جب معاویہ کا وقت وفات پہنچا تو

---

[1] مذکورہ بالا واقعات کے لیے ملاحظہ ہو استیعاب مطبوعہ مصر برحاشیہ اصابہ ج ۱ ص ۲۵۶، ۳۵۹۔

[2] اصابہ جلد ۳ ص ۶۵۱۔

انھوں نے تین مرتبہ کہا۔ یوم لی منہ ابن الادبر طویل۔ "حجرؓ بن عدی کے قتل سے مجھے طویل روزگار کا سامنا ہے۔"[1] (حزن و مشقت کی دنیا طولانی ہوتی ہے۔ جس طرح راحت و مسرت کی مختصر، لہٰذا مقصود یہ ہے کہ مجھے بڑی تکلیف و زحمت کا سامنا ہے۔ اس قتل کے سبب سے)

یہ تو حجرؓ کا قتل تھا لیکن دوسرے نہ معلوم کتنے بے گناہ تھے جو سیاست کی تیغ بے دریغ کی نذر ہو چکے تھے۔

یہ شرط تھی معاہدہ کی جس کی تعمیل اس طرح کی گئی۔

اس کے بعد وہ شرط تھی کہ کسی کو اپنا جانشین نہ بنائیں گے۔ یہ شرط کچھ زیادہ بیان کی محتاج نہیں ہے۔ معلوم ہے جو کچھ ہوا۔ جانشین بنایا گیا اور کون؟ یزید ایسا فاسق و فاجر، ننگ مسلمین و اسلام اور اس کی جانشینی کو مسلّم بنانے کے لیے کیا کیا تدابیر اختیار کیے گئے۔ کس طرح لوگوں سے بیعت حاصل کی گئی۔ وہ جلسے دیکھنے کے قابل تھے جو یزید کی جانشینی کے اعلان کے لیے منعقد کیے گئے تھے۔ کس طرح ان میں جبر و تشدد کا مظاہرہ تھا۔ کس طرح عام افراد کے ضمیر کو سنہرے اور روپہلے سکوں سے خریدا جا رہا تھا۔

اور یہی اسباب و ذرائع تھے جن سے یزید کی خلافت کو تسلیم کرایا گیا۔

اس کے بعد یہ شرط تھی کہ ظاہر بظاہر یا مخفی طور سے کسی طرح امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے قتل کی تدبیر نہ کی جائے۔

اس شرط کی خلاف ورزی کا اظہار کرنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے خفیہ ریشہ دوانیوں کے لیے ثبوت بہم پہنچانا انسان کا کام نہیں ہے۔

بہر حال یہ تو تقریباً تاریخ کی مسلمہ حقیقت ہے کہ امام حسنؑ زہر سے شہید کیے گئے۔ آپ کے قتل ہو جانے کی خبر پر شام کے قصر میں تکبیر کی صدا بھی بلند ہوئی

---

[1] طبری، ج ۶ ص ۱۵۶۔

اور اظہار مسرت بھی کیا گیا۔

اس سے زیادہ کہنا میری ذمہ داری کے خلاف ہے۔ خفیہ باتیں کھل جائیں تو وہ خفیہ کب رہیں۔ قرائن کی دنیا میں بے شک وسعت ہے لیکن اس کے لیے طولِ کلام کی ضرورت ہے۔

بہرحال شرائطِ معاہدہ پامال ہوئیں اور کسی ایک شرط پر بھی عمل نہ ہوا۔

حضرت امام حسینؑ کی جنگ

اور
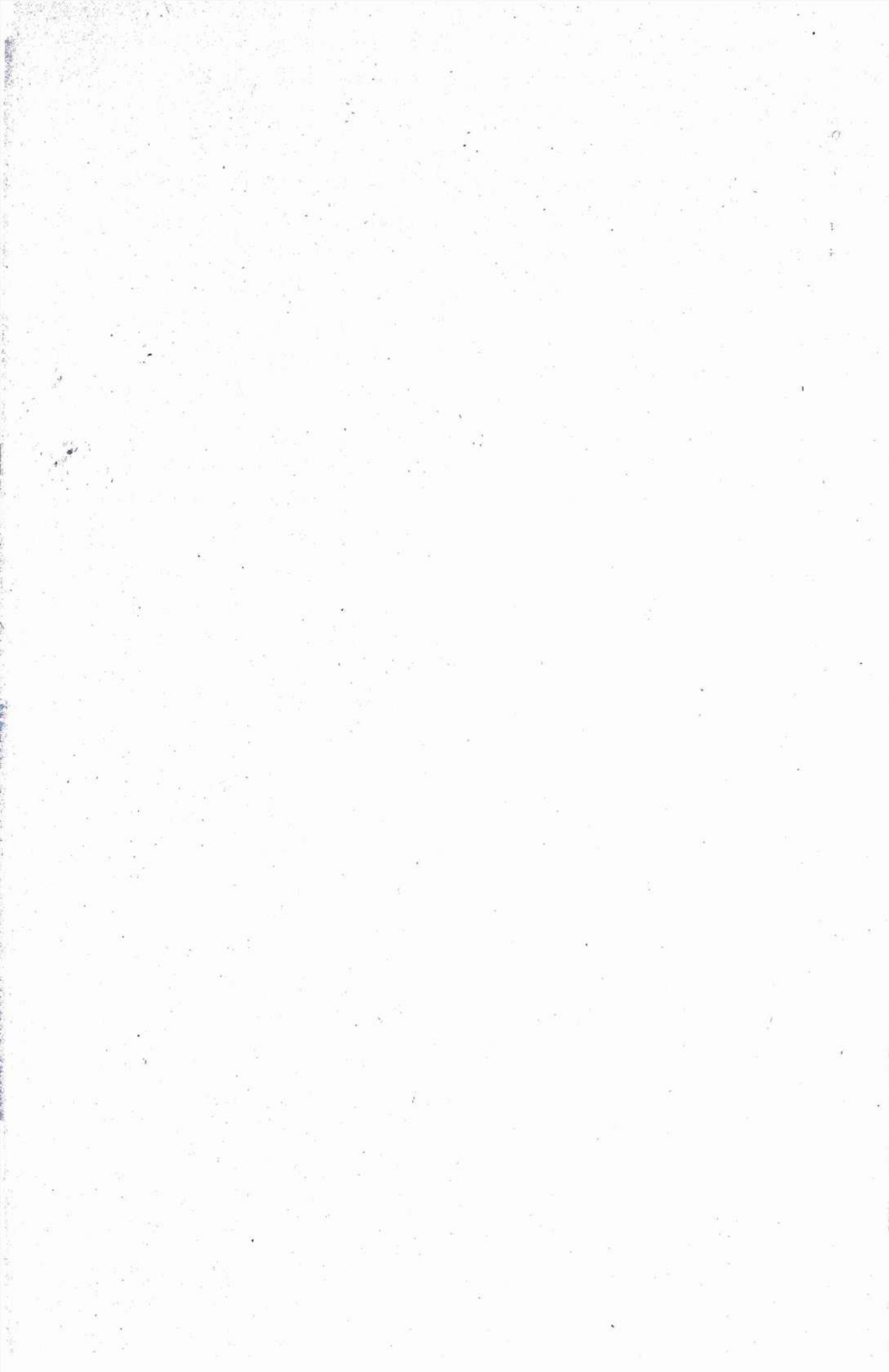
رواداری و صلح پسندی کے حیرت انگیز مظاہرات

مذکورۂ سابق صورتِ حال کے بعد جب کہ شرائط صلح بالکل پامال ہو چکے تھے، آپ اگر جنگ پر تیار ہو جاتے تو کسی کو الزام دینے کا حق نہ تھا مگر کیا کہنا فرزندِ رسولؐ کی رواداری کا، کہ وہ اس کے بعد بھی جنگ پر آمادہ نہ ہوئے، ن کا نصب العین یہی رہا کہ میں حمایتِ باطل سے علیحدہ رہوں لیکن امن سوزی ا خونریزی کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہ ہو۔

آپ نے مذکورۂ بالا خلاف ورزیوں کے بعد وہی طرزِ عمل اختیار کیا، جو ہر شائستہ اور پُرامن جماعت کے اندر اس قسم کی غیر آئینی باتوں کا اختیار کیا جاتا ہے۔

یعنی آپ نے ایک مکتوب کے ذریعہ سے جو حاکم شام کو تحریر فرمایا تھا مذکورۂ بالا باتوں پر احتجاج ضرور فرمایا۔ مکتوب طولانی ہے۔ جس کے ضروری اقتباسات ذیل میں درج ہیں۔

الست القاتل حجرا اخا کندۃ والمصلین العابدین الذین کانوا ینکرون الظلم ویستعظمون البدع ولا یخافون فی اللہ لومۃ لائم ثم قتلتھم ظلما وعدوانا من بعد ما کنت

اعطیتھم الایمان المغلّظة والمواثیق الموکّدة لا تاخذھم بحدث کان بینک وبینھم ولا باحنة تجدھا فی نفسک۔

"کیا تم نے نہیں قتل کیا ہے حجرؓ کو جو قبیلۂ کندہ سے تھے؟ اور ان نماز گذار عابدوں کو جو ظلم کو بُرا سمجھتے اور بدعتوں کو بڑی گراں چیز خیال کرتے اور خدا کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کے بُرا بھلا کہنے کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ پھر طرہ یہ کہ تم نے ان کو ظلم و عداوت سے اس وقت قتل کیا جب کہ تم ان کو بڑی بڑی قسموں اور مضبوط وعدوں کے ساتھ اس بات کا اطمینان دلا چکے تھے کہ تم ان سے کسی اس خصومت کا بدلہ نہ لوگے جو تمہارے ان کے درمیان میں رہی ہو اور نہ کوئی عداوت نکالو گے جو تمہارے دل میں پائی جاتی ہو۔"

اولست قاتل عمرو بن الحمق الخزاعی صاحب رسول اللہ العبد الصالح الذی ابلتہ العبادۃ فنحل جسمہ واصفرّ لونہ بعد ما امنتہ واعطیتہ من عھود اللہ ومواثیقہ مالو اعطیتھا طائرا لنزل الیک من راس الجبل ثم قتلتہ جرأۃ علی ربک و استخفافا بذالک العھد۔

"کیا تم نے عمرو بن حمق خزاعی کو نہیں قتل کیا جو رسالت مآبؐ کے صحابی اور ایسے نیک بندہ تھے جن کو عبادت نے پژمردہ کر دیا تھا اور اس سے ان کا جسم لاغر اور رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ جب کہ تم نے ان کو امان دی تھی اور عہد کیا تھا ایسی قسموں کے ساتھ کہ اگر کسی پرند طائر سے اسی طرح قسمیں کھائی جائیں تو وہ اطمینان کرلے اور پہاڑ پر سے اتر کر تمہارے پاس آجائے۔ مگر اس کے بعد تم نے انھیں قتل کر دیا اور اس طرح نہ خدا کا خوف کیا نہ اس عہد کا احترام۔"

الست المدعی زیاد بن سمیۃ المولود علی فراش عبید ثقیف فزعمت انہ ابن ابیک وقد قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الولد للفراش وللطاھر الحجر فترکت سنۃ رسول اللہ تعمداً وتبعت ھواک بغیر ھدی من اللہ ثم سلطنہ علی العراقین یقطع ایدی المسلمین وارجلھم ویسمل اعینھم ویصلبھم علی جذوع النخل۔

"کیا زیاد بن سمیہ جو قبیلہ بنی ثقیف کے ایک ذلیل وحقیر غلام کے بستر پر پیدا ہوا تھا، اس کو تم نے اپنے ساتھ ملحق نہیں کیا اور یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ تمھارے باپ کی اولاد ہے۔ حالانکہ رسالت مآب کی حدیث ہے کہ اولاد اسی سے ملحق ہے جس کا بچھونا ہو اور زناکار کے لیے خاک پتھر ہے اور بس۔ مگر تم نے جان بوجھ کر سنتِ رسولؐ سے مخالفت کی اور بغیر کسی دلیل کے اپنی خواہش نفس کی پیروی کی۔ پھر اس کو تم نے عراق، عرب اور عجم پر مسلّط کر دیا کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھ پاؤں قطع کرتا اور ان کی آنکھوں میں سلائیاں پھرواتا اور ان کو درختوں پر سولیاں دلواتا ہے۔"

اولست صاحب الحضرمیین الذین کتب فیھم ابن سمیۃ کانوا علی دین علیؑ فکتبت الیہ ان اقتل کل من کان علی دین علیؑ فقتلھم ومثل بھم بامرک۔

"کیا تم اس حضرمی جماعت کے خون کے ذمہ دار نہیں ہو جن کے بارے میں زیاد نے لکھ دیا تھا کہ یہ علیؑ کے دین پر ہیں، تم نے لکھا کہ جو شخص علیؑ کے دین پر ہو اسے قتل کر ڈالو۔ اس نے انھیں قتل کرا دیا اور ان کے اعضاء وجوارح کو قطع کیا تمہارے حکم سے۔"

ولعمری ما وفیت بشرط ولقد نقضت عهدک بقتلک هٰؤلآءِ النفرّ قتلتهم بعد الصلح والایمان والعهود المواثیق تقتلهم من غیران یکونوا قاتلوا و قتلوا ولم تفعل ذلک لهم الا الذکرهم فضلنا وتعظیمهم حقّنا۔

"حقیقت یہ ہے کہ تم نے ایک شرط کو بھی پورا نہیں کیا۔ تم نے اپنے عہد کو توڑ ڈالا ان لوگوں کے قتل کے ساتھ جنھیں تم نے صلح ہو چکنے اور عہد و پیمان ہو جانے کے بعد قتل کیا، تم نے انھیں قتل کیا بغیر اس کے کہ انھوں نے جنگ کی ہوتی اور کسی کو قتل کیا ہوتا اور تم نے جو کچھ کیا وہ صرف اس بنا پر کہ وہ ہمارے فضائل کو ذکر کرتے اور ہمارے حقوق کی معرفت رکھتے تھے۔"

کیا دنیا میں اس قسم کی کارروائیوں کے خلاف اس سے زیادہ کوئی پُرامن طریقہ ہے۔

امام حسینؑ نے رواداری سے کام لیا اور صرف احتجاج پر اکتفا فرمائی۔ دس برس تک امام حسنؑ کی وفات کے بعد خاموشی کی زندگی بسر کی۔ حالانکہ اس مدت میں کیسے صبر آزما مراحل پیش آئے۔

امام حسنؑ کی وفات اور رسولؐ کے روضہ میں دفن سے ممانعت، یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ حسینؑ! جن کی شجاعت، جن کی قوت و طاقت، جن کی ہمت و جرأت کا واقعۂ کربلا نے دنیا سے کلمہ پڑھوا دیا ہے وہ اس موقع پر خاموش رہتے ہیں۔ روضۂ رسولؐ سے پلٹا لیتے ہیں۔ اور بقیع میں دفن کر دیتے ہیں۔

یہ رواداری نہ تھی تو کیا تھی؟

یزید کی بالکل غیر آئینی خلافت کے سلسلہ میں معاویہ نے جو صورتیں اختیار کیں، جلسے کیے، ممالکِ اسلامیہ میں پیغام روانہ کیے، لوگوں کو بیعت پر مجبور کیا،

مگر امام حسینؑ کی طرف سے اس کے خلاف کوئی کاروائی نہ ہوئی۔

مثلاً یہ کہ اسلامی بلاد میں خطوط بھیجتے، احتجاجی جلسے کرتے۔ یہ ثابت کرتے کہ یزید کی ولیعہدی غلط ہے۔ آئین کے خلاف ہے۔ حق ہمارا ہے، مسلمانوں کو بغاوت پر آمادہ کرتے، یہ نہیں ہوا اور کوئی تاریخ دنیا کی اس قسم کی مثال پیش کرنے پر قادر نہیں ہے۔

حد یہ ہے کہ خود مدینہ منورہ میں محفلیں منعقد ہوئیں۔ مکہ معظمہ میں جب امام حسینؑ موجود تھے جلسہ کیا گیا۔ اور لوگوں سے بیعت لی گئی۔ کیا آپ اگر مخالفت کرتے تو اس کا کچھ اثر پیدا نہ ہوتا؟ لیکن آپ خاموش رہے۔ ہاں بے شک خود بیعت نہیں کی۔ جس کے معنی یہ تھے کہ ہم امن و امان کے طالب ہیں خاموشی پسند کرتے ہیں مگر حمایتِ باطل سے علیحدہ رہتے ہیں۔

ہم گوشہ نشین ہیں۔ ہمیں دنیا سے مطلب نہیں ہے تمہیں جو کرنا ہے کرو۔ جسے چاہو ولیعہد، بادشاہ جو کچھ بناؤ لیکن ہم سے مطلب نہ رکھو، ہم سے بیعت کے خواہاں نہ ہو۔ دنیا سے بیعت لے لو، لیکن ہم سے نہ لو۔ یہ اصول تھا جس پر امام حسینؑ اول سے قائم تھے اور آخر تک قائم رہے۔

جب معاویہ مدینہ منورہ آئے ہیں تو اس موقع پر انھوں نے امام حسینؑ کے سامنے بھی بیعت کی تحریک پیش کی۔ مگر آپ نے مناسب طریقہ سے اس مطالبہ کو ٹال دیا اور بیعت نہیں کی [1]

معاویہ نے اپنی آزمودہ کاری اور جہاندیدگی کی بنا پر آپ کے خلاف کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا اور نہ آپ کو مجبور کرنے کی ضرورت سمجھی۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ حسینؑ امن و امان کے حامی ہیں۔ جب تک ہم خود انھیں مجبور نہ کریں گے وہ امن پسندی سے علیحدہ نہ ہوں گے۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، "قاتلان حسینؑ کا مذہب" شائع کردہ امامیہ مشن پاکستان لاہور۔

لیکن اس کے بعد حاکم شام کا انتقال ہوگیا۔ اور یزید تختِ خلافت پر متمکن ہوا باپ بیٹے میں زمین آسمان کا تفرقہ تھا۔

وہ صحابۂ رسولؐ کے زمرہ میں محسوب۔ آپ کی بہن رسولؐ اللہ کے عقد میں تھیں، اور اس لیے آپ "خال المومنین" سے موسوم، بڑے بڑے اصحاب کی آنکھیں دیکھے ہوئے اور سرد و گرم زمانہ کو برداشت کیے ہوئے، سن رسیدہ، تجربہ کار، چالاک اس لیے ہر موقع و مقام پر سمجھ بوجھ کر قدم اٹھانے کی ضرورت محسوس کرتے تھے، لیکن یزید! عمر کا تقاضا جوانی کی امنگ، زندگی کے خاص مشاغل، اصحابِ رسولؐ کو چھوڑ کر دوسری قسم کے لوگوں کی صحبت۔ اس کا نتیجہ تھا کہ اسلامی احکام کی پابندی جس کی ظاہری طور پر ضرورت محسوس کی جاتی تھی اب بالکل ہی ملحوظ رکھنا ضروری نہ معلوم ہوتی تھی اور کسی طرح کی آئین پروری لازمی نہ تھی۔

امام حسینؑ اور ان تین دیگر اشخاص کے متعلق جنھوں نے بیعت نہیں کی تھی خود معاویہ نے بھی انتقال سے پہلے یزید کو متنبہ کر دینا ضروری سمجھا تھا، اور کہا تھا کہ مجھے ان لوگوں سے تمھارے متعلق خطرہ ہے [1]

یزید نے تختِ خلافت پر قدم رکھتے ہی انہی لوگوں کی طرف توجہ مبذول کرنا ضروری سمجھا اور ولید بن عقبہ کے نام خط لکھا۔ اسی خط سے افتادِ طبع کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ کس درجہ تشدد اختیار کیا جا رہا ہے معاویہ کے انتقال کا خط اور اس کے ساتھ ایک علیحدہ پُرزے پر یہ کہ حسینؑ اور ان لوگوں کو جنھوں نے بیعت نہیں کی ہے فوراً بیعت پر مجبور کرو، سختی سے کام لو، کسی قسم کی رعایت نہ ہونے پائے اور نہ مہلت دی جائے [2]

---

[1] ملاحظہ ہو ہمارا رسالہ "مجاہدۂ کربلا" ص۱۱

[2] ان واقعات کو ہم نے تفصیل سے "مجاہدۂ کربلا" میں لکھا ہے اس لیے اس موقع پر صرف واقعات کے حوالہ اور ان کے نتائج پر اکتفاء کریں گے۔

یہ خط ولید کے پاس پہنچا اور ولید نے مروان سے مشورہ کیا۔ مروان کی وہ ہستی ہے جو تمام تاریخوں کے متفقہ فیصلہ سے خلیفۂ ثالث کے قتل کی ذمہ دار قرار پاتی ہے جنگِ جمل میں طلحہ پر تیر لگانا بھی اسی کا کام تھا۔ اور امام حسنؑ کی وفات کے بعد آپ کو قبرِ رسولؐ کے پہلو میں دفن سے رد کرنے والی بھی یہی ذات تھی۔ ایسے شخص سے مشورہ کیا جا رہا ہے تو معلوم ہے کہ کیسا مشورہ ملے گا۔

مشورہ یہ ملا کہ ابھی ان لوگوں کو بلا کر بیعت طلب کرو۔ اگر منظور کریں تو خیر، نہیں تو ابھی قتل کرا دو۔

آدمی گیا اور امام حسینؑ و عبداللہ بن زبیر کو طلبی کا پیغام پہنچا دیا۔ امام حسینؑ ولید کے پاس تشریف لائے۔ مروان بیٹھا ہوا تھا۔

امامؑ کے ساتھ آپ کے اعزا و انصار کی ایک کافی جماعت مسلح و مکمل موجود تھی جس کو آپ نے دروازہ پر کھڑا کر دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ جب میں تمہیں بلاؤں یا ولید کی آواز بلند ہو تو تم اندر داخل ہو جانا۔

ولید نے معاویہ کے انتقال کی خبر اور بیعت کا پیغام دیا جسے سن کر حضرت نہ برافروختہ ہوئے نہ غصہ کا مظاہرہ کیا۔ بلکہ یہی چاہا کہ معاملہ کسی طرح ٹل جائے اور فرمایا۔

"اچھا! تو مجھ ایسے شخص سے تم بیعت لو گے تو اس پر تو راضی نہ ہو گے کہ میں مخفی طور سے بیعت کر لوں اور چلا جاؤں جب تک کہ اس کا عام طور سے علانیہ اظہار نہ ہو۔"

ولید نے کہا، "بے شک"

آپ نے فرمایا۔ "تو جس وقت تم معاویہ کی وفات کا اظہار کرنا اور عام لوگوں سے بیعت لینا تو مجھ سے بھی کہنا۔"

ولید نے منظور کیا۔ مروان نے دیکھا کہ میرا مقصد پامال ہو گیا۔ بگڑ کے بولا "اگر اس وقت حسینؑ ہاتھ سے نکل گئے تو پھر بغیر شدید خونریزی کے ہاتھ نہ آئیں گے

ابھی انھیں جانے نہ دو جب تک بیعت نہ کر لیں یا قتل کیے جائیں۔"
امام حسینؑ کو غیظ آگیا اور فرمایا: "کیا مجال تیری یا ولید کی جو مجھے قتل کر سکے"۔
یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر تشریف لے آئے۔
یہ معلوم ہے کہ جب ایک بادشاہ دنیا سے جاتا ہے تو لوگوں میں خاص طور سے اضطراب ہو جاتا ہے۔ اور نظامِ حکومت بھی انتہائی کمزور۔ اگر آپ چاہتے تو چونکہ اس وقت مدینہ میں ولید کے پاس کوئی فوج نہ تھی نہ لشکر، ولید کو قتل کر دیتے اور مروان کا کام تمام کر دیتے تو آپ دیکھتے وقتی حیثیت سے مدینہ میں امام حسینؑ کی سلطنت ہوتی۔ اور آپ کو موقع ہوتا کہ پھر اطراف و جوانب میں خطوط لکھ کر دوسرے لوگوں کو اپنے سے متفق کریں، مگر یہ تو آپ کو منظور ہی نہ تھا۔ آپ تو بس یہ چاہتے تھے کہ بیعت نہ کریں۔ حمایتِ باطل سے علیحدہ رہیں۔ اور بس، اس لیے آپ نے مدینہ چھوڑنا گوارا کیا اور کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔
امامؑ نے مدینہ سے ہجرت کی۔ کہاں تشریف لے گئے؟ مکہ معظمہ۔ مکہ معظمہ میں آپ کا تشریف لے جانا درحقیقت اس بات کا عملی ثبوت پیش کرنا تھا کہ آپ کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اپنی زندگی کو خطرہ سے محفوظ کریں۔ اور باطل کی حمایت سے الگ رہ کر زندہ رہیں، اس لیے کہ مکہ معظمہ لڑائی کی جگہ نہیں، پناہ کی جگہ ہے۔
مکہ معظمہ وہ جگہ ہے جس کو مامن الناس قرار دیا گیا ہے۔ آپ کا مکہ معظمہ میں جا کر ٹھہرنا یہ اس بات کا عملی ثبوت پیش کرنا تھا کہ ہم کوئی بغاوت کرنا نہیں چاہتے، اور کسی جماعت کے خلاف کوئی معاندانہ طرزِ عمل اختیار نہیں کرتے۔ ہم کو چھوڑ دو، گوشہ انزوا ہی میں سہی مگر ہم کو بیعت پر مجبور نہ کرو۔ وہی ایک اصول کہ "جیو اور جینے دو۔"
مکہ معظمہ میں آنے کے بعد دنیا کی کوئی تاریخ اس بات کا پتہ نہیں دے سکتی کہ آپ نے کچھ خطوط لکھے ہوں، کچھ لوگوں کو مکہ معظمہ کے اندر اپنی طرف دعوت دی ہو یا کچھ

لوگوں کو باہر سے بلایا ہو یا لشکر کشی اور فوج کی فراہمی میں کسی قسم کا کوئی قدم اٹھایا ہو آپ کی زندگی ایک خاموش زندگی معلوم ہوتی ہے۔

عبداللہ بن زبیر بھی مکہ معظمہ میں تھے اور پہلے لوگ ان کے گرد آ کر بیٹھا کرتے تھے لیکن جب سے آپ تشریف لائے تمام لوگوں نے عبداللہ کو چھوڑ دیا اور آپ کے گرد پروانہ وار مجتمع ہو گئے۔

ظاہر ہے کہ جناب رسالت مآبؐ سے جو نسبت آپ کو تھی اور مکہ والوں کو جتنی آپ کی ہستی عزیز ہو سکتی تھی اتنی عبداللہ بن زبیر کی نہیں تھی۔ عبداللہ کے لیے تو اتنی بڑی جماعت فراہم ہو سکی کہ وہ ایک عرصہ تک حکومتِ شام سے برسرِ پیکار رہ سکے، تو امام حسینؑ کے لیے یہ کیوں ممکن نہ ہوتا؟ مگر آپ نے مکہ معظمہ میں خاموشی کے ساتھ قیام کیا۔ نہ کوئی عملی قدم اٹھایا اور نہ کسی شورش کی تدبیریں کیں جس شخص نے مکہ معظمہ میں قیام اختیار کیا ہو وہ کیا یہ ثبوت پیش نہیں کر رہا ہے کہ وہ کسی سے جنگ کرنا نہیں چاہتا؟ یقیناً آپ اپنی خاموشی کے ساتھ اعلان کر رہے تھے کہ ہم دنیا میں امن کے خواہاں ہیں۔ چاہتے ہیں کہ دنیا میں امن و سکون رہے۔ مگر ہم بھی اپنے اس حق کے ساتھ جس پر اب تک قائم ہیں، قائم رہیں، امن و امان بھی ہو اور باطل کی حمایت بھی نہ ہونے پائے۔

عراق والوں کو خبر معلوم ہوئی کہ امام حسینؑ نے اس طرح بیعت سے انکار کیا ہے۔ سلیمان بن صرد کے گھر اجتماع ہوا اور امامؑ کے نام عرضداشت تحریر کی گئی کہ آپ یہاں تشریف لائیے، ہم آپ کی امداد کے لیے تیار ہیں۔

اس کے بعد اور خطوط روانہ ہوئے۔ کوفہ کی فضا وقتی حیثیت سے درست تھی۔ کچھ لوگوں نے دھوکا کھایا، کچھ نے دھوکا دیا۔ غرض ۵۳ عرضداشتیں دو دن کے اندر حضرت کی خدمت میں روانہ ہو گئیں۔ اور اس کے بعد بھی خطوط کا سلسلہ قائم رہا۔

ان تحریروں کی نوعیت کیا تھی؟ ان کا حقیقی مقصد کیا ہو سکتا تھا؟ ان سب لوگوں کو واقعی ہمدردی ہی تھی یا کچھ لوگوں کے دل میں اغراضِ فاسدہ کام کر رہے تھے؟

یہ سب چیزیں میرے موضوع سے خارج ہیں ان کو میں نے اپنے رسالہ "قاتلانِ حسینؓ کا مذہب" میں تفصیل سے لکھا ہے۔

میرا موضوع تو اس وقت یہ ہے کہ امام حسینؓ کے طرزِ عمل میں روادارانہ پہلو کس حد تک پایا جاتا ہے۔ اور آپ نے کس کس طرح صلح پسندی کا ثبوت دیا ہے۔

مجموعی خطوط کی تعداد سینکڑوں تک پہنچی اور خورجینیں مملو ہو گئیں۔ ان خطوط میں کیا تھا؟ یہ تھا کہ "ہمارا کوئی امام نہیں ہے۔ نعمان بن بشیر کے ساتھ ہم نماز نہیں پڑھتے جمعہ و جماعت میں شریک نہیں ہوتے، اگر آپ تشریف لے آئیے تو شاید ہم حق پر مجتمع ہو جائیں۔ ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ آپ تشریف لاتے ہیں تو نعمان بن بشیر کو نکال باہر کریں اور اسے شام جانے پر مجبور کر دیں۔"

امام حسینؓ نے ان خطوط کو ملاحظہ فرما کر مصلحتِ وقت کی بنا پر مناسب سمجھا کہ اپنے چچازاد بھائی جناب مسلمؒ بن عقیل کو کوفہ روانہ کریں کہ وہ حالات کا مطالعہ کر کے اطلاع دیں اور پھر اس کے مطابق صورتِ عمل کا تعین ہو۔

اس موقع پر جو خط آپ نے اہلِ کوفہ کے نام تحریر فرمایا اس کا مضمون قابل ملاحظہ ہے[1]

"یہ خط ہے حسینؓ بن علیؓ کا جماعت مومنین و مسلمین کی طرف۔ ہانی اور سعید تمھارے خطوط لے کر میرے پاس آئے (یہ "ہانی"، ہانی بن ہانی سبیعی اور "سعید"، سعید بن عبداللہ حنفی، یہ دونوں سب سے آخری خط لے کر آئے تھے جو آپ کی روانگی کا قریبی محرک تھا، اس لیے آپ نے انہی کا حوالہ دیا ہے)

یہ آخری دو شخص تھے جو میرے پاس تمھارے خطوط لے کر آئے ہیں۔ میں نے، جو کچھ تم نے لکھا تھا اس کو غور سے پڑھا، تمھارے اکثر

---

[1] خط کی اصلی عبارت کے لیے ملاحظہ ہو "مجاہدۂ کربلا" ص۴۲

خطوط کا مفاد یہ ہے کہ ہمارے لیے کوئی امام نہیں ہے۔ آپ آیئے تو
شاید آپ کی بدولت خدا ہم کو حق پر مجتمع کر دے۔ اچھا تو میں بھیجتا ہوں
تمہاری طرف اپنے بھائی، چچا کے بیٹے اور اپنے گھرانے والوں میں
سے ایسے شخص کو جس پر مجھ کو اعتبار ہے۔ میں نے ان سے کہا ہے
کہ یہ وہاں جا کر مجھ کو تمہارے آراء و خیالات سے مطلع کریں۔ اگر
انھوں نے مجھ کو تحریر کیا کہ تمہارے خیالات وہی ہیں جو تم نے اپنے
خطوط میں تحریر کیے ہیں اور صرف عوام نہیں بلکہ تم میں کے ذمہ دار
افراد بھی اس پر متفق ہیں تو میں انشاء اللہ تمہاری طرف بہت قریبی
زمانہ میں روانہ ہو جاؤں گا۔"

ان کے خطوط میں یہ بھی درج تھا کہ اگر آپ آجائیں تو ہم نعمان کو باہر نکال
دیں اور آپ کو حاکم بنا دیں۔ اس لیے حضرت نے آخری الفاظ تحریر فرمائے
ہیں۔ جو انتہائی توجہ کے مستحق ہیں۔

ما الامام الا العامل بالکتاب والاخذ بالقسط والدائن
بالحق والحابس نفسہ علیٰ ذات اللہ۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ امام کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ تاج و تخت
کا بھی مالک ہو، یا ظاہری ساز و سامان رکھتا ہو۔ قصر حکومت میں مقیم ہو۔" امام
وہ ہے جو کتابِ خدا کے ساتھ فیصلہ کرے۔ حق پر قائم رہے اور خدا کی مرضی
پر اپنی ذات کو قائم رکھے۔"

گو یا حضرت کا مقصد ہے کہ یہ سمجھنا کہ میں جو آرہا ہوں تو کسی کے خلاف
تلوار اٹھاؤں گا یا تختِ سلطنت پر قبضہ کرنے کے لیے آرہا ہوں۔ بلکہ مجھے ہدایتِ
خلق منظور ہے کتابِ الٰہی اور سنتِ رسالت پناہی کا اجراء مقصود ہے۔

دیکھیے خط میں اشارہ تک نہیں ہے کہ ہمارا سفیر جب تمہارے پاس پہنچے تو
کوفہ کے حاکم کو باہر نکال دینا۔ ہمارے سفیر اور ہمارے فرستادہ کو حکومت کا نظم سپرد

کردینا، اس وقت میرے آنے کی امید کرنا، بالکل نہیں، اس میں کسی قسم کی لشکر کشی و فوج آرائی کا تذکرہ بھی نہیں ہے۔ صرف احکامِ کتاب اللہ کی نشر و اشاعت جو ایک حقیقی معلمِ مذہب اور رہنمائے امت کا فرض ہو سکتا ہے اسی کو نصب العین قرار دیا گیا ہے۔

اگر دنیا بھی روادارانہ مسلک کی سالک ہوتی تو امام کا طرزِ عمل ذرا بھی فتنہ و فساد کا موجب نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ کوفہ تشریف لے جاتے، وہاں کے حالات کی اصلاح ہوتی اور پھر کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچتا، نہ خونریزی کا ذرہ بھر بھی شائبہ پیدا ہوتا لیکن وہ جماعت جسے ملت اسلامیہ کی مذہبی واقفیت اور شرعی پابندیوں کا احساس ہی اپنے لیے ایک صدمۂ جانکاہ معلوم ہوتا ہو اس کے لیے آپ کا اتنا ہی طرزِ عمل ہزار مصائب کا پیش خیمہ معلوم ہو سکتا ہے۔

حضرت مسلمؑ جو آپ کی تحریر کے مطابق آپ کے معتمدِ خاص اور قابلِ اعتبار تھے۔ وہ یقیناً آپ کی تعلیم سے یک سرِ مو انحراف نہ کر سکتے تھے۔ اس لیے ان کے طرزِ عمل کو دیکھنا بھی جو انھوں نے کوفہ میں اختیار کیا بہت حد تک امامؑ کے مقصد کو روشن بنا سکتا ہے۔

مادی نقطۂ نظر سے کہ جس کے لیے ظاہری طور پر اہلِ کوفہ امام حسینؑ کو دعوت دے رہے تھے۔ حضرت مسلمؑ جب حضرتؑ کی طرف سے نائبِ خاص بنا کر بھیجے گئے ہیں تو وہ ایک حاکم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو وقتی طور سے حکومت کے لیے بھیجے جا رہے ہیں۔ اس کا اقتضاء یہ تھا کہ حضرت مسلمؑ اپنے لیے ظاہری شان و شوکت، تمکنت و اقتدار کا اہتمام کرتے۔ کوفہ میں پہنچنے سے پہلے ایک دو دن کہیں ٹھہرتے۔ اہل کوفہ کو اپنے آنے کی اطلاع دیتے۔ لشکر کی تیاری کا حکم کرتے اور تمام اہل کوفہ کو استقبال کے لیے بلا کر انتہائی ساز و سامان کے ساتھ حاکمانہ شان سے کوفہ میں داخل ہوتے۔ پھر نعمان بن بشیر کا کوفہ کے دارالامارۃ سے اخراج کرتے اور خود دارالامارۃ پر قبضہ کر کے اس میں قیام فرماتے۔

مگر علیؑ کے بھتیجے اور حسینؑ کے سفیر نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا؟ یہ کہ فقیرانہ لباس میں بغیر کسی سابقہ اطلاع یا تزک و احتشام کے کوفہ میں داخل ہو گئے۔ نعمان بن بشیر دارالامارۃ کے اندر تخت و تاج کا مالک۔ حضرت مسلمؑ کو نہ اس سے کوئی مطلب اور نہ تعرض۔ آپ جاتے ہیں اور ایک متوسط الحال انسان مختار بن ابوعبیدہ ثقفی کے مکان میں فروکش ہو جاتے ہیں۔

وہاں اجتماع ہوتا ہے تو امامؑ کا خط پڑھ کر سنا دیتے ہیں اور بس۔

لوگ امامؑ کی اطاعت اور محبت و الفت کا عہد و پیمان کرتے ہیں اور آپ ان سے بیعت لیتے ہیں۔ یہ بیعت اس کی دلیل نہیں ہے کہ آپ کوئی بغاوت برپا کرنا چاہتے ہیں یا ایک سلطنت کی بنیاد قائم کر رہے ہیں۔

بیعت کا مفادِ اصلی ایک معاہدہ اور قرارداد سے آگے نہیں ہے۔ ہر چیز کے لیے ایک رسم ہوتی ہے۔ اور وہ رسم اس حقیقت کی مظہر۔ جیسے ہمارے یہاں کی عام خلقت میں بھی کسی بات کا عہد و پیمان ہوتا ہے تو کہتے ہیں "لاؤ ہاتھ تو ملاؤ" یہ ایک مظاہرہ ہوتا ہے دست بدست ہونے کا۔

یوں ہی عرب میں جس وقت خرید و فروخت کا مسئلہ بائع و مشتری کے درمیان طے پاتا تھا تو ہاتھ پر ہاتھ مارتے تھے۔ جس کی وجہ سے معاملہ بیع کے لیے صفقہ کے لفظ کا استعمال ہونے لگا۔ اسی طرح مختلف قسم کے معاہدات جو ہوتے تھے تو اُن میں کوئی مظہرِ عملی شرکائے معاہدہ کے درمیان عمل میں آتا تھا۔ جو کبھی خصوصی حیثیت سے ایجاد کیا جاتا تھا۔ جیسے ایک مخصوص جنگ کے لیے عہد و پیمان اور قسم لیے جانے کے موقع پر منشم عورت کے یہاں کا عطر تھا جس میں سب نے انگلیاں ڈبوئی تھیں، اور یہ مظاہرہ تھا اس معاہدہ کی تکمیل کا اور چونکہ اس جنگ میں ہزاروں آدمیوں کی خونریزی ہوئی اس لیے یہ مثل عرب کی ہو گئی کہ "اشأم من عطر منشم" یعنی یہ چیز منشم کے عطر سے زیادہ منحوس ہے" اسی طرح عمومی طریقہ معاہدہ کا جو تھا وہ بیعت یعنی "ہاتھ میں

ہاتھ دینا۔" یہ رمز ہوتا تھا اس بات کا کہ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اور قرار داد پر قائم رہوں گا۔

تو اس بیعت سے یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہیے کہ بیعت تو سلطنت ہی کے لیے ہوتی ہے۔ لہذا آپ نے جو بیعت لی تو آپ یقیناً یزید کے خلاف حکومت کی بنیاد قائم کر رہے تھے۔

ایسا نہیں ہے۔ آج بھی پیر و مرید کے درمیان بیعت کا طریقہ جاری ہے لیکن اس میں نہ کوئی فوج کشی ہوتی ہے، نہ سلطنت کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

یہ بیعت جو حضرت مسلمؑ نے لی یہ بھی اسی قرار داد کی پہچان تھی کہ ہم حضرت امام حسینؑ کی پیروی اور حضرتؑ کے اتباع پر آمادہ ہیں اور حضرتؑ کی حفاظت و حمایت میں بجان و دل کوشاں رہیں گے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے مذہبی عقیدہ میں سلطنت اہلِ بیتؑ کا حق تھی اور یہ تاریخی مسلمہ حقیقت ہے کہ اہل بیتؑ اپنے تئیں خلافت و امامت و امارتِ مسلمین کا سب سے زیادہ حقدار سمجھتے تھے۔ لہٰذا اگر حقیقتاً امام حسینؑ خلافت کے طالب بھی ہوتے اور یہ بیعت جو اہلِ کوفہ سے لی گئی وہ تشکیلِ سلطنت ہی کے لیے ہوتی تب بھی حقانیت، صداقت اور مذہبی حیثیت سے کوئی الزام آپ پر عائد نہیں ہوتا۔ ایک شخص اپنا حق سمجھتا ہے اس کو طلب کرتا ہے اور دوسروں کو اس کے تسلیم کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

کوئی الزام مذہبی حیثیت سے امام حسینؑ کے دامن پر نہیں آتا۔ مگر چونکہ دنیا میں آئین پسندی و حق پرستی اور چیز ہے اور جہانبانی و جہانداری اور چیز۔ اس صورت میں دنیا کو یہ کہنے کا حق ضرور پیدا ہوتا کہ یزید مذہبی حیثیت سے حق پر نہ سہی لیکن ہم معاویہ کے زمانہ سے اس سلطنت کو خلافتِ راشدہ اور امامتِ حقہ تھوڑی سمجھتے ہیں۔ ہماری نظر میں وہ سلطنت ہے اور ملوکیت، جہانداری و جہانبانی کا تقاضا یہی ہے کہ جو شخص بھی مقابلہ پر آمادہ ہو چکا ہے وہ کتنا ہی حقدار کیوں نہ ہو لیکن جب ہمارے مقابل ہو تو سیاست جابرہ کے عمل میں اسے پامال ہی کر

دیا جائے اور اس کی زندگی کو فنا، لہٰذا یزید نے جو کچھ کیا وہ مذہبی حیثیت سے حق بجانب نہ سہی لیکن جابرانہ سیاست کے رُو سے اور ملوکانہ اصول کے تحت اس کو کرنا ہی چاہیئے تھا۔ جو اس نے کیا۔ بادشاہِ وقت کے خلاف کھڑا ہونے والا کتنا ہی حقدار ہو مگر اصولِ بادشاہت کے تحت نظم و نسق کی حفاظت میں وہ قتل ضرور کیا جائے گا۔

لیکن میرے مذکورہ بالا بیان کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر ملوکانہ اصول کے تحت دیکھا جائے تب بھی امام حسینؑ کے خلاف یزید کا اقدام حق بجانب نہیں معلوم ہوتا۔ یعنی شاہی اور جہانبانی کے آئین و اصول کی رو سے بھی امام حسینؑ کا کوئی طرزِ عمل باغیانہ نہ تھا۔ اور شورش انگیزی کی صورت نہیں تھی۔

آپ صرف ہدایتِ خلق، امورِ مذہبی کی اصلاح اور روحانی تربیت کے لیے کوفہ کی طرف روانہ ہوئے تھے، آپ چاہتے تھے کہ میں کسی طرح موقع پاؤں اور دنیا کو اخلاق و تہذیب اور تعلیماتِ اسلامی کے سکھانے کا فرض انجام دے سکوں۔ آپ نے اسی کو ان الفاظ میں تحریر کیا تھا۔ کہ "امام وہ ہے جو کتابِ خدا پر عمل کرے اور سنّت رسولؐ پر پابندی کے ساتھ قائم رہے۔ اپنے نفس کو خدا کی مرضی پر منحصر رکھے۔"

آپ یہ چاہتے تھے "سلطنت تم کو مبارک (حکومت تم کو مبارک) مگر فرائضِ اسلام میں تغیر و تبدل نہ ہو۔ اسلام کی تعلیم اور دنیا کی اخلاقی تربیت کا ہم کو موقع حاصل رہے بس یہ صورت امام حسینؑ کے طرزِ عمل میں نمایاں ہے۔

اگر مادی حیثیت سے آپ یزید کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھانا چاہتے تو کیا اس کی تیاریاں ایسی ہی ہوتیں جیسی آپ نے کیں؟ بے شک حسینؑ یزید کی سلطنت کے تختہ کو الٹنا چاہتے تھے مگر سلطنت حاصل کر کے نہیں بلکہ اپنی جان دے کے۔

یقیناً اگر اس حیثیت سے امامؑ کامیابی حاصل کرنا چاہتے تو وہ کامیابی محدود حیثیت رکھتی۔ اس صورت میں کہ جب کوفہ میں حالات سازگار ہوتے اور سب لوگ

آپ کی بادشاہت تسلیم کر لیتے تو بھی کیا ہوتا ؟ وہی جو امیر المومنینؑ کو ضروریاتِ وقت سے مجبور ہو کر گوارا کرنا پڑا تھا۔ یعنی عراق کی حکومت امام حسینؑ کے پاس اور شام کی حکومت یزید کے پاس ہوتی۔ دونوں طرف کی حکومتوں میں مقابلہ ہوتا رہتا۔ مسلمانوں کی طاقتیں آپس میں لڑ کر پاش پاش ہوتی رہتیں۔ مگر امام حسینؑ نے جان دے کر جو کامیابی حاصل کی وہ نہ باعتبار حدودِ مملکت محدود تھی اور نہ باعتبار حدودِ زمانہ محدود۔ اس طرح کی فتح جو حسینؑ نے اپنے قتل کے ذریعہ سے حاصل کی۔ وہ ایسی تھی کہ ادھر کوفہ کے اندر اضطراب ہوا ادھر حجاز کے اندر تہلکہ پیدا ہوا۔ اور خود شام میں جہاں یزید کے فدائی تھے اور وہ بنی امیہ کے نام پر جان دیتے تھے یہ احساس پیدا ہوا کہ حق کس طرف تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ اموی تختِ سلطنت الٹا اور اس طرح کہ دنیا میں اس کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا۔

یہی وہ فتح ہے جو امام حسینؑ نے قتل ہو کر حاصل کی جو زندگی میں آپ کو کبھی حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ امام حسینؑ یہ ضرور چاہتے تھے کہ میں یزید کے تختِ سلطنت کو برباد کر دوں۔ مگر اس طرح نہیں کہ آپ کے ہاتھوں مسلمانوں کی خونریزی ہو، دنیا قتل ہو، جنگ کے شعلے بلند ہوں اور بعد اس کے یزید کی سلطنت کو رخنہ آئے بلکہ آپ چاہتے تھے کہ خود اپنے تئیں تیر ونیزہ وشمشیر کے حوالہ کریں اور اس طرح تختِ سلطنتِ یزید کو تباہ کر دیں۔

یہ تھا امام حسینؑ کا طرزِ عمل اور یہ تھی آپ کی سیاست۔ جو آخر وقت تک قائم رہی۔ امام حسینؑ نے جہاں تک موقع ملا جنگ سے کنارہ کشی کی۔ آپ جانتے تھے کہ نتیجہ قتل ہونا ہے۔ لیکن آپ حفاظتِ خود اختیاری کی ایسی صورتیں بھی اختیار کر رہے تھے کہ خود کشی کا الزام آپ کی طرف عائد نہ ہو۔

آپ شرائط پیش کرتے تھے۔ آپ ایسے مواقع بہم پہنچاتے تھے کہ "حمایتِ باطل" سے الگ رہتے ہوئے کسی صورت سے آپ کی جان محفوظ رہے۔ مگر جس وقت یہ جواب ملا کہ یزید کے ساتھ "بیعت" یعنی معاہدۂ اطاعت کرو تو یہ حمایتِ باطل کا

سوال تھا۔ اس کے لیے امام حسینؑ کسی صورت سے تیار نہ تھے۔ کہ آپ اپنے اس مسلک کو جو آپ نے مذہبی نقطۂ نظر سے دیانتداری کی بنا پر طے کیا تھا، اس کو ایک لحظہ کے لیے بھی ترک کر دیں۔

آپ کا طرزِ عمل شروع سے یہی قائم رہا۔ امن پسندی کا عنصر برابر کارفرما رہا۔ حضرت مسلمؑ کی بیعت اٹھارہ ہزار کوفہ کے لوگوں نے کی۔ مگر اس کے بعد بھی انھوں نے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ پھر بھی وہ اسی مختارؓ کے گھر میں مقیم رہے۔ نعمان بن بشیر کو اسی طرح تختِ حکومت پر رہنے دیا۔ خود نعمان کو اس کا احساس تھا کہ جناب مسلمؑ کا طرزِ عمل معاندانہ نہیں ہے۔ جب لوگوں نے کہا کہ مسلمؑ بیعت لے رہے ہیں اور اس طرح کے سامان کر رہے ہیں اور تم خاموش بیٹھے ہو کوئی قدم نہیں اٹھاتے تو نعمان نے جواب دیا۔ لا اقاتل الا من قاتلنی و لا اثب الا علیٰ من وثب علیّ ولا اٰخذ بالقرفۃ والظنّۃ فمن ابدی صفحتہ و نکث بیعتہ ضربتہ بسیفی ما ثبت قائمہ فی یدی ولو لم اکن الّا وحدی۔

"میں بس اسی شخص سے جنگ پر تیار ہوں جو مجھ سے جنگ کرے اور اسی پر حملہ کر سکتا ہوں جو مجھ پر حملہ کرے اور میں بدگمانیوں اور سوءِ ظن کی باتوں پر عمل نہیں کرتا۔ ہاں جو شخص منہ در منہ میرے سامنے آئے اور بغاوت پر آمادہ ہو اس کا تلوار سے مقابلہ کروں گا۔ جب تک قبضہ میرے ہاتھ میں رہے چاہے کوئی میرا ساتھ دینے والا نہ ہو اور میں تنہا ہوں" [1]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ نعمان بھی اس بات کا احساس رکھتا تھا کہ مسلمؑ کوئی باغیانہ قدم نہیں اٹھا رہے ہیں۔

---

[1] اخبار الطوال ص ۲۳۳۔

اس کے بعد اُن اسباب کی بناء پر جو ہم نے "قاتلانِ حسینؑ کا مذہب" رسالہ میں لکھے ہیں نعمان بن بشیر معزول کیا گیا اور عبداللہ بن زیاد کوفہ کا گورنر مقرر ہوا۔ اور پُرامن وصلح پسند، خاموش وگوشہ گزین مدینہ کا رہنے والا پردیسی مسافر (مسلم بن عقیلؑ) بیدردی سے قتل کردیا گیا۔

مگر افسوس ہے کہ حضرت مسلمؑ بیعت کرنے والی جماعت کے جوش وخروش کو دیکھ کر امام حسینؑ کو اطلاع دے چکے تھے کہ کوفہ کے لوگ آپ کی اطاعت پر آمادہ ہیں اور آپ کو تشریف لانا لازمی ہے۔

اس کے بعد شریعت ظاہریہ کے اصول واسباب کی بناء پر آپ کو کوفہ جانا ضروری ہوگیا تھا۔ آپ نے کوفہ جانے میں جلد بازی سے کام نہیں لیا تھا۔ ایک دو، دس، بیس، نہیں، تین سو سے لے کر بارہ سو تک کے اندر اندر خطوط آچکے۔ آپ کے نمائندہ خصوصی حضرت مسلمؑ کی تحریر آچکی تھی کہ جلدی تشریف لائیے۔ لیکن اس کے بعد بھی حضرتؑ زیادہ تعجیل کے ساتھ مکہ معظمہ سے روانگی پر آمادہ نہ تھے۔ خصوصًا جب کہ آپ حج کا احرام باندھ چکے تھے۔ اور زمانہ حج کا بہت کم باقی تھا۔ مگر نہ معلوم کیا تھا کہ ایک مرتبہ آپ نے اپنا ارادہ تبدیل فرمایا۔ اور بالکل جس طرح رسالت مآبؐ نے حج کو عمرہ سے تبدیل فرمایا تھا۔ اسی طرح آپ نے بھی طرزِ عمل اختیار کیا۔

کیا اس امر سے کسی خاص حقیقت کا پتہ نہیں چلتا۔ ظاہری حالات سے تو کوئی امر نمایاں نہیں ہے۔ اور نمایاں ہو تو کیونکر۔ اس لیے کہ مکہ معظمہ میں ظاہری طور پر کوئی فوج یا لشکر نہیں ہے اگر بھیس بدلے ہوئے مختلف لباسوں کے اندر کچھ اشخاص ہوں تو عام نگاہیں انھیں دیکھیں تو کس طرح ؟

بے شک یہ راز اس وقت کھلا جب امامؑ مکہ معظمہ سے روانہ ہو چکے اور راستہ میں فرزدق شاعر نے حضور کی خدمت میں باریابی حاصل کی۔ انھوں نے عرض کیا کہ یابن رسول اللہؐ اتنی جلدی کا ہے کی تھی کہ حج بھی نہ کیا ؟ آپ نے

فرمایا "اگر میں اتنی جلدی نہ کرتا تو گرفتار ہو گیا ہوتا"
اس کے معنی یہ ہیں کہ مکہ معظمہ میں جو امن و امان کی جگہ ہے۔ جو خاموش رہنے کا مقام ہے جہاں پر جنگ و جدال جائز نہیں ہے کچھ لوگ بھیجے گئے تھے۔ حاجیوں کے لباس میں اور انھیں ہدایت تھی کہ منیٰ میں، عرفات میں، حالتِ طواف میں، جس جگہ بھی حسینؑ گرفتار ہو سکیں انھیں گرفتار کر لینا۔

یہ سبب تھا کہ امامؑ نے مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی غور کرنے سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ معاملہ کتنا اہم تھا اور خطرہ کس قدر نزدیک۔ جس شخص کو عبادتِ الٰہی کا انتہائی جذبہ و شوق ہو جس نے مرتے مرتے عبادت ہی کے لیے ایک شب کی مہلت مانگی ہو وہ عین حج کے موقع پر حج کو ترک کر دے۔

یقیناً آپ کو قوی اندیشہ تھا کہ اگر آپ نے مکہ معظمہ میں قیام کیا تو بہت جلد آپ پر حملہ ہو جائے۔ بے شک اس کے لیے ایک صورت یہ تھی کہ وہیں تحفظی تدابیر اختیار کیے جائیں۔ مگر اس میں تصادم کے امکانات بہت قریب تھے۔ لہٰذا جس طرح مدینہ سے نکل کر آپ نے ثابت کر دیا کہ مجھے جنگ کرنا منظور نہیں ہے۔ اسی طرح اس وقت جب حج قریب تھا مکہ معظمہ سے مہاجرت کر کے ثابت کر دیا کہ میں صعوباتِ سفر برداشت کر دوں گا۔ لیکن خود جہاں تک ممکن ہو گا۔ جنگ کا موقع پیش نہ آنے دوں گا۔

امام حسینؑ کوفہ روانہ ہوتے ہیں کیا آپ نے کوئی تیاری کی ہے؟ سامان جنگ کیا ہے؟ کچھ نہیں بلکہ اس کے خلاف ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کے ساتھ مخدّراتِ عصمت ہیں، بچے ہیں، متعلقین ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ پُرامن رہنا چاہتے ہیں۔ صبر و سکون منظور ہے، جنگ کے لیے نہیں جا رہے ہیں۔
متعلقین کو اپنے ساتھ لے کر سفر پر آمادہ ہونا یہ اعلان تھا امن پسندی کا۔ یہ اعلان تھا اس امر کا کہ ہم جنگ کا خیال تک دل میں نہیں رکھتے۔ اگر جنگ کا ارادہ ہوتا تو عورتوں اور بچوں کو اپنے ساتھ نہ لے جاتے۔

راستہ طے ہونے لگا۔ کوفہ خطوط روانہ کیے گئے کہ ہم آرہے ہیں مگر وہاں حالات میں تبدیلی ہو چکی ہے۔ جناب مسلمؑ سے فضا مخالف ہو چکی اور ان کی شہادت بھی ہو گئی۔

رسالت مآبؐ نے جس طرح سے امن پسندی کا ثبوت دیا تھا وہی طرزِ عمل ان کے فرزند کے یہاں نمایاں ہے۔

رسالت مآبؐ جب مکہ معظمہ کے قریب پہنچے تھے تو مخالف جماعت کے لشکر پر نظر پڑی تھی اور آپ نے اپنے راستہ کو بدل دیا تھا۔ اور یہ ثابت کیا تھا کہ ہمیں لڑنا منظور نہیں ہے۔ اسی طرح حسینؑ جارہے ہیں اور سامنے سے حُرؓ کا لشکر آتے ہوئے نظر پڑا تو آپ نے راستہ بدل دیا۔ اور داہنی طرف کا رخ کر کے ذوحسم کے پہاڑ کے دامن میں جا کر قیام کیا۔[1]

اس راستہ کے بدل دینے سے کیا یہ مطلب نہیں ثابت ہوتا کہ اگر تم ہم سے کوئی روک ٹوک نہ کرتے تو ہم کوفہ جانے کے لیے تیار تھے۔ مگر جب یہ سامان ہے تو چونکہ ہمیں جنگ منظور نہیں ہے ہم کوفہ نہ جائیں گے، کسی دوسری طرف چلے جائیں گے۔

بے شک رسولؐ کی مخالف جماعت چونکہ خود جنگ کا جوش نہ رکھتی تھی۔ اور صرف جذبۂ عناد سے مجبور ہو کر مقابلہ پر آئی تھی۔ اس لیے اس نے جب حضرتؐ کو راستہ چھوڑتے ہوئے دیکھا تو واپس آ گئی مگر یہ آنے والی فوج خود تشدد پر آمادہ اور رواداری و صلح پسندی سے علیحدہ تھی۔ اس لیے جدھر آپ کو متوجہ دیکھا اسی طرف یہ لشکر بھی متوجہ ہو گیا۔

یہ ایک ہزار کی جمعیت تھی جو حر بن یزید ریاحی کی قیادت میں حصین بن تمیم افسر افواجِ قادسیہ کی طرف سے روانہ کی گئی تھی۔ (عام طور سے واقعۂ کربلا کے

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "مجاہدۂ کربلا" ص ۷۹

سلسلہ میں حصین بن نمیر کا نام لیا جاتا ہے اور اس کے متعلق مختلف واقعات کی نسبت دی جاتی ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔)

حصین بن نمیر سکونی شام کا باشندہ اور شامی افواج کا ایک افسر تھا۔ جو دمشق میں مقیم تھا۔ اور واقعۂ کربلا میں عراق کے حدود میں بھی موجود تھا۔

لیکن یہ حصین جس کا تذکرہ واقعۂ کربلا کے سلسلہ میں ہے یہ حصین بن تمیم تمیمی ہے جو کوفہ میں کوتوال کی حیثیت رکھتا تھا اور جس وقت امام حسینؑ کے کوفہ کی طرف متوجہ ہونے کی اطلاع ملی ہے اور ابن زیاد کی طرف سے ناکہ بندی کا انتظام کیا جانے لگا ہے۔ تو اس کو دس ہزار کی فوج کے ساتھ قادسیہ میں مقرر کیا گیا تھا۔ کہ جو شخص کوفہ میں آنا چاہے اور جو باہر جانا چاہے اس کی دیکھ بھال اور نگہداشت ہو۔

یہ قادسیہ عین راستہ میں واقع تھا۔ اور امام حسینؑ اگر مشہور و معروف راستہ سے آتے تو پہلے آپ کو قادسیہ پہنچنا پڑتا۔ لیکن چونکہ آپ غیر معروف راستہ سے آرہے تھے اس لیے قادسیہ داہنے طرف چھوٹ گیا۔ اور مخبروں کے اطلاع دینے سے حصین کی جانب سے حُر بن یزید کو آپ کے سدِ راہ ہونے کے لیے بھیجا گیا۔

عبداللہ بن یقطر اور قیس بن مسہر صیدادی اسی حصین بن تمیم کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تھے۔ اور واقعۂ کربلا میں بھی جن واقعات میں حصین کا نام ہے جیسے نماز ظہر کی اجازت کے موقع پر حصین کا کہنا صلّ ما بدا لك وہ بھی حصین بن نمیر نہیں حصین بن تمیم ہے۔ اور یہ حصین کربلا ہی میں امام علیہ السلام کی بددعا سے جو آپ نے فرمادی تھی ہلاک ہو گیا۔ اور واقعۂ کربلا کے بعد کے لیے باقی نہیں رہا۔ لیکن حصین بن نمیر وہ تو شام میں باقی رہا اور عبداللہ بن زبیر کے مقابلہ کو جو فوج روانہ کی گئی اس کا افسر ہوا اور مکہ معظمہ کے محاصرہ اور خانہ کعبہ پر منجنیق کے ذریعہ سے سنگباری ایسے کارناموں کو اس نے انجام دیا۔

حُر کی فوج کے ساتھ جو واقعات امامؑ کو پیش آئے ان کے تذکرہ کا یہ موقع نہیں ہے لیکن صرف اس قدر جو ہمارے موضوع کلام یعنی ثبوتِ رواداری سے تعلق رکھتے ہیں۔

حضرتؑ کا سب سے پہلے فوج حُرؑ کو سیراب کر دینا اس کا بہت بڑا ثبوت تھا کہ کوئی جنگجو یا نہ جذبہ کار فرما نہیں ہے۔ نمازِ ظہر کے وقت امام حسینؑ نے دونوں طرف کی فوج کے سامنے تقریر فرمائی جس میں ارشاد ہوا:

انی لم آتکم حتیٰ اتتنی کتبکم وقدمت علیّ رسلکم ان اقدم علینا فانہ لیس علینا امام لعل اللّٰہ ان یجمعنا بک علی الھدی فان کنتم علیٰ ذلک فقد جئتکم فان تعطونی ما اطمئن الیہ من عھودکم ومواثیقکم اقدم مصرکم وان لم تفعلوا وکنتم لمقدمی کارھین انصرفت عنکم الی المکان الّذی اقبلت منہ الیکم۔

”میں نے اس وقت تک تمہاری جانب آنے کا خیال نہیں کیا جب تک تمہارے خطوط میرے پاس نہیں گئے۔ اور قاصد نہیں پہنچے کہ ہمارا کوئی امام نہیں ہے۔ آپ آیئے شاید آپ کی وجہ سے ہم حق پر مجتمع ہو جائیں۔ اب اگر تم اسی بات پر قائم ہو تو مجھ سے عہد و پیمان کرو۔ اور میں تمہارے ساتھ کوفہ چلنے پر تیار ہوں اور اگر تمھیں یہ منظور نہیں ہے اور میرا آنا ناگوار ہے تو میں جہاں سے آیا ہوں وہاں واپس جاتا ہوں۔“

کیا رواداری اور شورش انگیزی سے علیحدگی کا اس سے بڑھ کے ثبوت ہو سکتا ہے؟

فوجِ مقابل کی طرف سے کچھ جواب نہیں ملا اور آپ نے ظہر کی نماز پڑھائی عصر کے قبل پھر آپ نے تقریر فرمائی اور یہی کہا کہ ”اگر تمھیں میرا آنا پسند نہ ہو تو

ہیں واپس چلا جاؤں"۔

حرؓ نے خطوط کے معاملہ سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کیا۔ حضرت نے عقبہ بن سمعان کو حکم دیا اور انھوں نے دو خورجیاں بھری ہوئی خطوط کی سامنے لاکر پیش کر دیں۔

حُر نے کہا مجھے اس سب سے مطلب نہیں، مجھے تو یہ حکم ہے کہ جہاں آپ مل جائیں آپ کو گھیر کر ابن زیاد کے پاس لے چلوں۔

حضرتؑ نے اس سے انکار فرمایا۔ آپ کا کوفہ کی طرف جانا، دو ہی صورتوں سے ہو سکتا تھا، یا آپ فاتحانہ صورت سے داخل ہوں یعنی راستہ کے انتظامی افواج کا قلع قمع کرنے، طاقت و اقتدار کے ساتھ کوفہ پر قابض ہوں، مگر اس صورت میں جنگ ناگزیر تھی اور وہ حضرتؑ کی امن پسندی اور صلح پروری کے خلاف تھا۔ اور یا آپ خاموشی کے ساتھ جائیں۔ لیکن یہ اس وقت پر کہ جب فوج دشمن کی موجود ہے اور اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ آپ کو گھیر کر ابن زیاد کے پاس لے جائے، اپنے ہاتھ سے اپنے تئیں گرفتار کرانا ہے اور قید ہو کر دشمن کے پاس جانا ہے۔

اس لیے حضرتؑ کے لیے امن پسندی اور خودداری دونوں باتوں کی حفاظت کے ساتھ کوفہ جانا ممکن نہ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ واپس جاتا ہوں، حُر نے کہا "یہ ممکن نہیں ہے"۔ اور فوج سدِّ راہ ہوئی۔

جہاں تک کہ زبانی گفتگو کا سلسلہ تھا، آپ الفاظ سے جواب دیتے رہے اور اپنے ارادہ پر مُصر تھے، لیکن اب عملی تصادم کی نوبت آگئی تھی۔ حُرؓ کی فوج سامنے کھڑی تھی اور آگے بڑھنے کے لیے راستہ نہ دیتی تھی۔

صورتِ حال نازک تھی اور اصحاب کو بھی جوش پیدا ہو گیا لیکن حضرتؑ کو جنگ منظور نہ تھی۔

کافی ردّ و بدل ہونے کے بعد حُرؓ نے یہ صورت پیش کی کہ آپ نہ تو کوفہ کی

طرف جائیں اور نہ مدینہ کی طرف، بلکہ ایسا راستہ اختیار کریں جو کوفہ اور مدینہ کے علاوہ کسی دوسری طرف کو گیا ہو۔ حضرتؑ نے اسے منظور فرما لیا۔ اور یہ چاہا کہ جنگ نہ ہو اگرچہ اس سلسلہ میں آپ کسی ہی سرزمین پہ پہنچ جائیں۔

اب ظاہری صورت سے کوئی مقصد امامؑ کے پیش نظر نہیں ہے۔

کوفہ جانا منظور تھا مگر وہ ارادہ بدل چکا، مدینہ جانے کا قصد کیا، اسے فوج مخالف نے گوارا نہیں کیا۔ اب تیسری طرف کا رخ ہے اور کوئی خاص منزل مدِّ نظر نہیں ہے لیکن جاتے جاتے ایک جگہ پر جو پہنچے تو کوفہ کا قاصد حُرؓ کے نام خط لاتے ہوئے نظر آیا رواداری کے خلاف تشدد کا مظاہرہ اس کا نام ہے۔

یہ خط ہے کوفہ کے حاکم عبداللہ بن زیاد کا حُرؓ بن یزید ریاحی کے نام جس میں لکھا ہے:

اما بعد فجعجع بالحسین حین یبلغک کتابی ویقدم علیک رسولی فلا تنزله الا بالعراء فی غیر حصن وعلی غیر ماء وقد امرت رسولی ان یلزمک ولا یفارقک حتیٰ یاتینی بانفاذک امری والسلام۔

"حسینؑ کے ساتھ سختی سے کام لو اور حسینؑ کو اترنے پر مجبور کرو" "ایک خشک زمین پر جہاں کوئی پناہ لینے کا ٹھکانا اور پینے کے لیے پانی موجود نہ ہو، میں نے قاصد سے کہہ دیا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ ساتھ رہے جب تک کہ میرے حکم کی تعمیل نہ ہو جائے"۔

یہ خط تھا جس کے بعد حُرؓ امام حسینؑ کی خدمت میں آیا اور کہا:

"دیکھیے یہ ابن زیاد کا خط ہے اور اس میں مجھے آپ کے ساتھ سختی کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ قاصد میرے ساتھ ہے اور میں حکم کی تعمیل پر مجبور ہوں"۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ اب حُرؓ آگے بڑھنے سے مانع تھا۔ اور اتنی سختی کے

ساتھ کہ حضرتؑ نے فرمایا ہم کو اس قریہ میں قیام کر لینے دو جس کا نام نینوا ہے یا اس میں جس کا نام غاضریہ ہے یا اس میں جس کا نام شفیہ ہے، مگر حرؒ نے کہا کہ مجھے حکم ہے کہ میں آپ کو کسی آباد مقام پر نہیں بلکہ چٹیل میدان میں اترنے پر مجبور کروں۔ جہاں پانی بھی قریب نہ ہو۔ اصحاب کو جوش پیدا ہو گیا۔ زہیرؓ بن قین نے عرض کیا۔ یا ابن رسول اللہ ان قتال ھؤلآء اھون علینا من قتال من یاتینا من بعد ھم۔ فرزند رسولؐ۔ ان لوگوں سے جنگ کر لینا ہمارے لیے آسان ہے بہ نسبت ان افواج سے جنگ کے جو ان کے بعد آئیں گی لہٰذا ہم کو ان سے لڑ لینے دیجئے۔ مگر امام حسینؑ نے فرمایا ما کنت لا بدأھم بالقتال۔

"میں جنگ کی ابتدا نہیں کرنا چاہتا۔" اس کے معنی یہ ہیں کہ قیام کر لو۔ یہیں جہاں یہ کہتے ہیں مگر لڑائی نہ ہونے پائے۔

قیام ہو گیا اور خیام آلِ محمدؐ برپا ہو گئے اس صحرا میں جس کا نام ہے کربلا۔

دیکھیے امام حسینؑ کس کس طرح جنگ سے علیحدہ رہنا چاہتے ہیں مگر آپ کو کس طرح مجبور کیا جا رہا ہے۔

دوسرے ہی دن سے فوجوں کی آمد شروع ہو گئی مشہور صحابی سعد بن ابی وقاص کا لڑکا عمر کوفہ سے چار ہزار آدمیوں کی معیت میں آیا۔

ملکِ عجم میں بغاوت ہوئی تھی، اور "دستبیٰ" کے مقام پر قبیلہ دیلم نے غلبہ پا کر قبضہ کر لیا تھا۔

ابن زیاد نے عمر سعد کو اسی مہم کے لیے مامور کر کے چار ہزار کی فوج سپرد کی تھی۔ اور حکومت رَے کا پروانہ بھی تحریر کر دیا تھا۔ اور ابن سعد اسی فوج کو ساتھ لیے ہوئے بیرون کوفہ مقام "حمام اعین" پر خیمہ زن تھا۔ جب امام حسینؑ کا معاملہ پیش آیا تو ابن زیاد نے عمر سعد کو اسی فوج کی معیت میں کربلا جانے کا حکم دے دیا۔

یہ چار ہزار آدمی تو اس طرح پہلے سے تیار تھے ہی، اور وہ ایک مرتبہ کربلا پہنچ گئے۔ اس کے بعد عام فوجی بھرتی شروع ہوگئی۔ اور حکم ہوا کہ جو شخص حسینؑ سے جنگ کے لیے نہ جائے گا اس کا گھر گرا دیا جائے گا۔ چنانچہ ایک شام کا آدمی کسی ضرورت سے کوفہ آیا ہوا تھا اس کو قتل بھی کرا دیا گیا کہ اہل کوفہ کے دل پر رعب چھا جائے اور وہ جنگ کے لیے روانہ ہونے میں پہلو تہی نہ کریں۔

عمر سعد نے کربلا آکر (چونکہ اس کو احساس تھا کہ مجھے کس سے جنگ کے لیے بھیجا گیا ہے اور یہ جرم کتنا سنگین ہے) امام حسینؑ سے نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کیا دیکھنا یہ ہے کہ امام حسینؑ کا طرزِ عمل اس نامہ و پیام کے جواب میں کیسا ہوتا ہے۔ کیا آپ اپنی طرف سے کچھ شرائط کو مسترد کرتے ہیں یا خود ایسے شرائط پیش کرتے ہیں جن میں صلح و آشتی کا جوہر کار فرما ہو۔ مگر دشمن ان کو رد کرتا ہے۔

حضرت نے اپنی طرف سے عمرو بن قرظہ انصاری کو عمر سعد کے پاس روانہ فرمایا کہ آج شب کو مجھ سے دونوں طرف کی افواج کے درمیان میں ملاقات کرنا۔ فخرج عمر بن سعد فی نحو من عشرین فارساً واقبل حسین فی مثل ذلک۔ عمر بن سعد کوئی بیس سوار اپنے ساتھ لے کر نکلا۔ اور حضرت بھی تقریباً بیس جان نثاروں کو ساتھ لے کر تشریف لے گئے۔ فلما التقوا امر حسین اصحابہ ان یتنحوا عنہ وامر عمر بن سعد اصحابہ بمثل ذالک۔" جب دونوں آدمی قریب پہنچے تو امام حسینؑ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ وہ آپ سے علیحدہ ہو جائیں جس پر عمر بن سعد نے بھی اپنے ساتھیوں کو علیحدہ ہونے کا حکم دیا۔"

دیکھیے سواروں کو اپنے ساتھ لانے کی ابتدا عمر بن سعد کی طرف سے تھی۔ شاید اس خیال سے کہ مخالف کا سامنا ہے۔ معلوم نہیں صورتِ حال کیا پیش آئے۔

غالباً عمر سعد کی اس جمعیت کو ساتھ دیکھ کر امامؑ کے ساتھ اصحاب خود ہو گئے ہوں گے کہ پھر ہم بھی آپ کو تنہا نہ جانے دیں گے۔ لیکن اصحاب کو علیحدہ کرنے میں پہل حضرتؑ کی طرف سے ہے۔ اس سے یہ دکھانا منظور تھا کہ خالص نیت اور صاف دل اور صبر و سکون کے ساتھ گفتگو کرنے کا ارادہ ہے۔ جس میں فوج و جمعیت کی ضرورت نہیں ہے۔ جب عمر سعد نے یہ دیکھا کہ آپ تنہا رہ گئے ہیں اور ساتھیوں کو الگ کر دیا ہے تو اس نے بھی اپنے ساتھیوں کو علیحدہ ہونے کا حکم دیا۔

راوی کا بیان ہے کہ ہم لوگ سب ہٹ گئے۔ اس طرح کہ نہ ہمیں بات چیت معلوم ہوتی تھی اور نہ آواز سنائی دیتی تھی۔ گفتگو بہت دیر تک ہوئی۔ یہاں تک کہ رات کا بڑا حصہ گزر گیا۔ پھر ہر ایک اپنی جماعت کی طرف واپس گیا۔ گفتگو صیغۂ راز میں تھی۔ مگر لوگوں کو ایسے مواقع پر خواہ مخواہ کے لیے قیاس آزمائی کا شوق ہوتا ہے۔ یزید کے ہوا خواہوں نے طرح طرح کی باتیں بنا ڈالیں یہاں تک کہا کہ امام حسینؑ عمر سعد سے کہتے تھے کہ مجھے یزید کے پاس لے چلو، میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔

لیکن عقبہ بن سمعان کا بیان ہے کہ جب سے امام حسینؑ مدینہ سے روانہ ہوئے اور کوفہ پہنچے۔ وہاں اور یہاں اور راستہ میں کبھی حضرت کی زبان سے یہ نہیں نکلا کہ مجھے یزید کے پاس لے چلو، میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔

بے شک جس بات پر تمام راویوں کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ حضرت نے فرمایا تھا کہ مجھے دور و دراز حدود ملک اور اجنبی شہروں میں چلا جانے دو، تاکہ تمھیں اطمینان حاصل ہو۔ اور مجھ سے خطرہ باقی نہ رہے۔

عمر سعد نے احساس کیا کہ امام حسینؑ کا طرزِ عمل صلح پسندانہ اور روادارانہ ہے۔ اس نے ابن زیاد کو خط لکھا کہ امام حسینؑ صلح پر آمادہ ہیں وہ لکھتا ہے کہ:

مُبارک ہو! خدا نے فتنہ کی آگ کو فرد کیا۔ اور مسلمانوں کے شیرازہ کو مجتمع کیا، اور امتِ اسلامی کے امر کی اصلاح کی۔"

حسینؓ صلح پر آمادہ ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ میں جہاں سے آیا ہوں واپس جاؤں یا دور دراز ممالک میں چلا جاؤں۔

پھر عمر سعد اپنی ذاتی رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھتا ہے، کہ

ھٰذا الکم رضی و للامتہ صلاح۔

"میرے خیال میں یہ بات ایسی ہے جو تم لوگوں کی مرضی کے مطابق اور امت اسلامی کے صلاح و فلاح کا باعث ہے۔"

طبری میں ہے کہ ابن زیاد نے بہت خوشی کے ساتھ اس رائے کو منظور کرنا چاہا اور کہا۔

ھٰذا کتاب رجل ناصح لامیرہ مشفق علیٰ قومہ قد قبلت

"یہ ایسے شخص کا ساخط ہے جو اپنے حاکم کا خیر خواہ اور اپنی قوم کا ہمدرد ہو۔ بیشک مجھے منظور ہے۔" مگر شمر بگڑ گیا۔ اور کھڑے ہو کر کہنے لگا۔

"بھلا ایسا موقع جس کے ہاتھ آئے وہ اسے چھوڑ دے؟ حسینؑ آپ کے پہلو میں آگئے ہیں۔ اگر آج وہ چلے گئے اور انھوں نے آپ کی اطاعت اختیار نہ کی۔ تو پھر یاد رکھیئے کہ قوت و عزّت انہی کا حق ہے اور کمزوری و عاجزی آپ کا حصہ۔ میری رائے میں کبھی ان کی یہ خواہش منظور نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس میں بڑی ذلت ہے اور کمزوری کی دلیل ہے۔ بے شک انھیں آپ کے حکم پر راضی ہو جانا چاہیئے۔ یعنی وہ یہ کہہ دیں کہ جو ابن زیاد میرے ساتھ چاہے سلوک کرے۔ اگر آپ انھیں قتل کرنا چاہیں تو آپ کا حق ہے اور اگر معاف کر دیں تو اس کا بھی آپ کو اختیار ہے۔ رہ گیا عمر سعد اس کا کیا ذکر۔ میں نے تو سنا ہے کہ پوری پوری راتیں حسینؓ کے ساتھ

باتوں میں گزر جاتی ہیں۔"
ابن زیاد پر دنیا طلبی کے جذبات غالب آگئے اور اس نے کہا۔
نعم مارأیت الرائ رائیك ۔ "کیا کہنا تیرا رائے تو تیری رائے ہے۔"
اس کے بعد اس نے شمر کو بلا کر ایک خط اس کے سپرد کیا، اور کہا یہ خط میرا عمر سعد کے پاس لے جاؤ اور اس سے کہو کہ وہ حسینؑ اور اصحاب حسینؑ کے سامنے میرے حکم کی پابندی کا مطالبہ پیش کرے۔ اگر وہ منظور کریں تو وہ ان کو خاموشی کے ساتھ میرے پاس بھیج دے اور اگر وہ انکار کریں تو ان سے جنگ کرے۔ اگر عمر سعد اس حکم کی تعمیل کرے تو خیر نہیں تو وہ معزول ہے۔ اور تم اس کی جگہ سردار لشکر ہو۔ تم جنگ کرنا، اور عمر سعد کو قتل کر کے اس کا سر میرے پاس بھیج دینا۔

وہ خط جو عمر سعد کے نام تھا حسب ذیل ہے:
امّا بعد فانّی لم ابعثك الیٰ حسین لتکفّ عنه ولتطاوله ولا لتمنیه السلامة والبقاء ولا لتقعد له عندی شافعا انظرفان نزل حسین واصحابه علی الحکم واستسلموا فابعث بهم الیّ سلما وان ابوا فازحف الیهم حتی تقتلهم ان انت مضیت لامرنا فیه جزیناك جزآء السامع المطیع وان ابیت فاعتزل علمنا وجندنا وخلّ بین شمر بن ذی الجوشن وبین العسکر فانّا قد امرنا ه بامرنا والسّلام
"میں نے تجھ کو حسینؑ کی جانب اس لیے نہیں بھیجا تھا کہ تو ان کے ساتھ مراعات کرے یا ان کے ساتھ معاملات کو طول دے یا ان کو زندگی کی امیدیں دلائے یا میرے پاس بیٹھ کر ان کی سفارش کرے۔ دیکھ اگر حسینؑ اور ان کے اصحاب سب میرے حکم کے اوپر رضامند ہوں اور جو میں ان کے ساتھ سلوک کرنا چاہوں اس

کو منظور کرلیں تو ان کو آہستگی کے ساتھ میرے پاس بھیج دے اور اگر انکار کریں تو ان کے اوپر حملہ کر دے یہاں تک کہ انھیں قتل کر ڈالے۔"

اس کے بعد انتہائی سخت اور تشدد آمیز احکام کیفیت شہادت اور اس کے بعد کے متعلق ہیں جو کسی طرح انسانیت و شرافت کے حدود میں داخل نہیں ہیں اور اس کے بعد یہ ہے کہ اگر تو نے ان احکام کا اجرا کیا تو خیر۔ تجھے معاوضہ ملے گا۔ وہ جو ایک وفادار اطاعت گزار کو ملنا چاہیے۔ اور اگر تو نے اسے منظور نہ کیا تو لشکر کی سرداری سے علیحدہ ہو جا اور اسے شمر کے سپرد کر دے جس کو ہم نے کافی ہدایتیں کر دی ہیں۔

شمر یہ خط لے کر کربلا پہنچا اور عمر سعد کو دیا۔

دیکھیے شہامتِ طبع ایسی تو ہو۔ ثباتِ قدم اور استقلال ایسا ہو جس کا دشمن بھی احساس رکھتے ہوں۔ اور اس کا اعتراف کرتے ہوں۔ عمر سعد نے خط دیکھا اور بغیر اس کے کہ امام حسینؑ کے پاس جا کر اس کے مضمون کی اطلاع دے، اس نے اپنے مقام ہی پر کہہ دیا اور شمر سے خطاب کیا۔

مالک و یلک لا قرب اللّٰہ دارک و قبح ما قدمت بہ علیّ و اللّٰہ انی لاظنک انت ثنّیتہ ان یقبل ما کتبت بہ الیہ افسدت علینا امراً کنا رجونا ان یصلح لا یستسلم و اللّٰہ حسین ان نفساً ابیّۃ لبین جنبیہ۔

"یہ تو نے کیا کیا؟ خدا تجھ سے سمجھے، خدا تجھے غارت کرے اور بُرا کرے اس پیغام کا جو تو میرے پاس لایا ہے خدا کی قسم میرا خیال ہے کہ تو ہی نے ابن زیاد کو میرے مشورہ کے قبول کرنے سے روک دیا۔ اور اس بات کو بگاڑ دیا، جس کے بن جانے کی ہم کو اُمید تھی۔ خدا کی قسم حسینؑ کبھی اپنے تئیں ابن زیاد کے رحم و کرم پر نہ چھوڑیں گے۔ یقیناً حسینؑ ایک غیور دل اپنے سینہ میں رکھتے ہیں۔"

یہ تھا آپ کا استقلال کہ جس کا دشمن کے دل پر اثر قائم تھا اور وہ کہتا تھا کہ:

"ان کے پہلو میں ذلت سے انکار کرنے والا، ایک خود دار دل ہے"۔

شمر نے کہا کہ ان باتوں کو جانے دو، یہ بتاؤ کہ اب کروگے کیا؟ اپنے حاکم کے حکم پر عمل کروگے یا سرداری لشکر میرے سپرد کردو گے؟

عمر سعد نے چاروناچار کہا کہ "نہیں، میں خود ہی اس حکم پر عمل کروں گا، سپہ سالاری ترک کرنا مجھے منظور نہیں ہے۔

اب عمر سعد کو فکر ہوگئی کہ کہیں جلدی حملہ ہوجائے تاکہ میری وفاداری و خیر خواہی میں کمی نہ ثابت ہو۔ نویں تاریخ کا دن قریب ختم اور عصر کا وقت بھی منقضی ہوچکا تھا شام کا وقت قریب تھا، جب عمر سعد نے حکم دے دیا کہ پوری فوج حسینؑ اور اصحابِ حسینؑ پر ٹوٹ پڑے۔

اچانک، بلا اطلاع، امام حسینؑ اپنے خیمہ کے دروازہ پر تلوار کا سہارا لیے ہوئے گھٹنوں پر سر رکھے کچھ غنودگی کے عالم میں کہ ایک مرتبہ دشمن کی حملہ آور فوج کے شور و غل کی آواز خیمہ میں گئی اور جناب زینبؑ کے کان میں پہنچی اور آپ مضطرب ہوگئیں۔ امام حسینؑ کو بیدار کیا حضرتؑ نے جناب عباسؑ کو بلایا، فرمایا جاؤ دیکھو تو واقعہ کیا ہے۔ اور یہ ناگہانی حملہ کیسا ہے؟ جناب عباسؑ بیس انصار کے ساتھ تشریف لے گئے فرمایا۔ ما بدا لکم وما تریدون۔

"تمھاری رائے کیسے بدلی اور کیا چاہتے ہو"؟

معلوم ہوا ابن زیاد کا خط آیا ہے کہ یا امامؑ اپنے تئیں اس کے رحم و کرم کے حوالہ کردیں اور یا جنگ کی جائے۔

آپ نے فرمایا کہ ٹھہرو میں حضرتؑ سے دریافت کرلوں پھر جواب دوں گا۔

فانصرف العباس راجعا یرکض الی الحسین یخبر بالخبر۔

"جناب عباسؑ گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ آپ سے صورت حال کا تذکرہ کریں۔"

بیس آدمی جو ساتھ گئے تھے وہ دشمن کے مقابل کھڑے رہے اور اس موقع کو غنیمت سمجھ کر یہ چاہا کہ تبلیغ کے فرض کو انجام دے لیں۔ حبیبؓ بن مظاہر نے زہیر بنؓ قین سے کہا کہ دل چاہے تو ان لوگوں سے کچھ باتیں کرو اور نہیں، کہو تو میں گفتگو کروں زہیرؓ نے کہا۔ "تمہارے ہی دل میں خیال آیا ہے تو تمہیں گفتگو بھی کرو۔"

حبیبؓ بن مظاہر نے مخالف فوج کے سامنے تقریر شروع کی۔ کہنے لگے اما واللہ لبئس القوم عند اللہ غدا قوم یقدمون علیہ قد قتلوا ذریۃ نبیہ وعترتہ واھل بیتہ وعبادا اھل ھذا المصر المجتہدین بالاسحار والذاکرین اللہ کثیرا۔

"کیوں مسلمانو! کیا اس جماعت سے بڑھ کر روزِ قیامت کوئی قوم رسوا ہوگی جو اس طرح خدا کا سامنا کرے کہ اس نے اپنے نبیؐ کی اولاد کو قتل کیا ہو اور ان کی عزت و اہل بیتؑ کا خون بہایا ہو، اور اس شہر کے ان عبادت گزار بندوں کو قتل کیا ہو جو راتوں کو جاگ کر بسر کرتے اور خدا کے ذکر میں برابر مصروف رہتے تھے۔"

گفتگو ہو رہی تھی کہ جناب عباسؑ واپس آئے، کہا۔" امامؑ نے ایک شب کی مہلت مانگی ہے۔ صبح کو دیکھا جائے گا۔"

عمر سعد کے لیے شمر کی موجودگی انتہائی دہشت انگیز۔ اس کو اپنی وفاداری و خیر خواہی کا ثبوت بہم پہنچانا۔ سرداری لشکر کہیں ہاتھ سے نہ جائے حاکم کے خیالات خراب نہ ہوں۔ وہ شمر کی طرف متوجہ ہوا۔ کہا۔ کیوں تمہاری کیا رائے ہے؟ اس نے کہا۔" جو تمہاری رائے۔"

"میری تو رائے ہے کہ مہلت نہ دی جائے۔" یہ عمر سعد کا انتہائی تشدد آمیز رویہ تھا جو اس نے صرف سالاریٔ لشکر کے چلے جانے کے خوف میں اختیار کیا تھا۔

پھر دوسرے سردارانِ لشکر کی طرف متوجہ ہوا۔ "کیوں تمھاری کیا رائے ہے؟"
عمرو بن حجاج زبیدی نے کہا:

"سبحان اللہ واللہ لو کانوا من الدیلم ثم سالك هذہ المنزلة لکان ینبغی لك ان تجیبهم الیها۔"

"واہ! اگر کفار ترک و دیلم بھی ہوتے اور وہ اتنی رعایت کے طالب ہوتے تو ان کے ساتھ اتنی رعایت کرنا چاہیئے تھی۔"

"قیس بن اشعث نے بھی کہا کہ "خواہش منظور کرو اور مہلت دے دو۔"

یہ ایک رات کی مہلت تھی جو لے لی گئی۔ کیا کسی جنگ کی تیاری کے لیے؟ نہیں صرف خدا کی عبادت کے لیے، نماز و تہجد کے لیے۔

شب گزری اور نہیں کہنا چاہتا، کس طرح گزری، صبح ہوئی اور عاشور کی قیامت خیز صبح، پیمانہ لبریز ہے، پانی سر سے اونچا ہے۔ حملہ ہو چکا اور کوئی امید صلح کی باقی نہیں رہی، لیکن حسینؑ اب بھی امن پسندی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ جس کی نظیر تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ مثال ناممکن ہے۔ اتمام حجت کی اتنی منزلیں، امن پسندی کے اتنے مظاہرات، ایک ایسے شخص کی طرف سے جو اپنی جان کے خوف سے ایسا نہ کر رہا ہو۔ جس نے موت کو اپنی آخری منزل سمجھ لیا ہو۔ اور اس کا اعلان کرتا رہا ہو جو موت کا استقبال کشادہ پیشانی کے ساتھ کرنے پر تیار ہو (جیسا کہ واقعات نے یقینی طور پر ثابت کر دیا ہے) اس کے بعد یہ امن پسندی، یہ صلح پروری، یہ اشتعال سے علیحدگی، یہ اپنے جوش کی روک تھام۔ یہ اپنے ساتھیوں کے جذبات کی نگہداشت۔

یقیناً معلوم ہوتا ہے کہ امام جہاد بالسیف سے پہلے جہاد بالنفس کی منزل

طے کر رہے تھے۔ جہادِ اصغر کے ساتھ جہادِ اکبر کا فرض ادا کر رہے تھے۔
حسینؑ نے صبح کی میدانِ جنگ میں، رات بھر کے جاگے خدا کی عبادت کیے، نمازِ صبح کے فرض سے فراغت پاتے ہی دشمن کی صفوں کا سامنا، مگر اب امامؑ کا طرزِ عمل کیا ہوتا ہے۔
یاد رکھیئے۔ جنگ کی سواری ہے گھوڑا، عام سفر کی سواری ہے ناقہ، اس لیے عرب میں سفر کو جو جاتے تھے تو گھوڑا ساتھ رکھتے تھے، کہ جنگ ہوگی تو گھوڑے پر سوار ہو لیں گے۔
ناقہ ہے امن کی سواری، فوج کی ترتیب ہو چکی مگر حسینؑ ناقہ طلب کرتے ہیں۔ ناقہ پر سوار ہوئے، قرآن اپنے ہاتھ میں لیا۔ صفوفِ لشکر کے سامنے تشریف لائے تقریر شروع کی اور بلند آواز سے، جو فوج کے اکثر حصہ تک پہنچ سکتی تھی۔ ارشاد فرمایا:

"ایھا الناس اسمعوا قولی ولا تعجلونی حتیٰ اعظکم بالحق لکم علیّ۔"

"ایہا الناس۔ میری بات سنو، جلدی نہ کرو، یہاں تک کہ میں تم کو نصیحت کروں اس حد تک جو تمہارا حق ہے میرے اوپر" (کہ تمہیں بے خبر نہ رہنے دیا جائے اور حقیقتِ حال سے مطلع کر دیا جائے جس کے بعد اتمامِ حجت میں کوئی کمی نہ رہے۔ یہ ہے ایک ہادیٔ برحق کی شان کہ ایسے موقع پر بھی ہدایت میں کوتاہی نہیں کرتے، امامت کے فرض کو انجام دے رہے ہیں)

وحتیٰ اعتذر الیکم من مقدمی علیکم فان تبلتم عذری وصدقتم قولی واعطیتمونی النصف کنتم بذلک اسعد ولم یکن لکم علیّ سبیل وان لم تقبلوا منی العذر ولم تعطوا النصف من انفسکم فاجمعوا

امرکم وشرکاءکم ثم لایکن امرکم علیکم غمّۃ ثم اقضوا الیّ۔ لاتنظرون ان ولییّ اللّٰہ الذی نزل الکتاب وھو یتولّی الصالحین۔

"میں چاہتا ہوں کہ تمھارے سامنے اپنا عذر پیش کردوں، کہ میں کیوں آیا اور کس لیے تمھارے شہر کا رُخ کیا؟ اگر تم نے میرے عذر کو تسلیم کیا، اور میرے کہے کو مانا اور میرے ساتھ انصاف کیا۔ تو یہ تمھاری خوش قسمتی ہوگی اور تم کو اس وقت میرے خلاف قدم اٹھانے کا کوئی حق معلوم نہ ہوگا۔ اور اگر تم نے میرے عذر کو نہ مانا اور انصاف کرنا نہ چاہا تو مجھ کو کوئی پرواہ نہیں ہے تم اور جس جس کو چاہو تمام دنیا کی جماعتوں کو اپنے ساتھ متفق کرلو، اور میری مخالفت پر ہم آہنگ ہوجاؤ۔ پھر دیکھو کوئی حسرت تمھارے دل میں نہ رہ جائے اور پوری طاقت سے میرا خاتمہ کردو۔ مجھے ایک لحظہ کی بھی مہلت نہ دو۔ میرا بھروسہ تو بس خدا پر ہے جس نے قرآن کو نازل کیا ہے اور اچھے اعمال والوں کا وہی مددگار ہے۔"

جب آپ کا خطبہ یہاں تک پہنچا تو مخدراتِ عصمت سے جو حضرتؑ کی تقریر پر گوش برآواز تھیں گریہ کا شور بلند ہوا۔ حضرتؑ نے جناب عباسؑ و علی اکبرؑ کو بھیجا کہ انھیں خاموش کرو۔ ابھی کیا ہے؟ رونے کا موقع تو زیادہ بعد کو آئے گا۔

جب رونے کی آواز موقوف ہوئی تو حضرتؑ نے حمدِ خدا ادا فرمائی، اور حمد و صلوٰۃ میں بہت دیر تک اپنی زبان کو مصروف رکھا۔ یہ اطمینانِ قلب ہے۔ یہ ثباتِ قدم ہے جس کا تاریخ میں ان الفاظ میں تذکرہ ہے کہ:

حمد اللّٰہ و اثنیٰ علیہ و ذکر اللّٰہ بما ھو اھلہ وصلّی علیٰ محمد صلی اللّٰہ علیہ وعلیٰ ملٰئکتہ و ابنیائہ

فذکر من ذلك ما الله اعلم و ما لا یحصی ذکرہ۔

"حمدِ خدا ادا کی اور حضرت احدیت کے ان اوصاف کا تذکرہ کیا جو اس کی شانِ جلال و کمال کے لائق ہیں اور جناب رسالت مآبؐ پر درود بھیجا، اور بہت دیر تک حضرتؐ کے اوصاف کو بیان فرمایا۔"

راوی بیان کرتا ہے۔ فو اللہ ما سمعت متکلما قط قبلہ ولا بعدہ ابلغ فی منطق منہ۔

"خدا کی قسم اس دن کے قبل اور اس دن کے بعد میں نے حضرتؑ کا ایسا فصیح البیان مقرر نہیں دیکھا۔"

پھر فرمایا:

اما بعد فانسبونی فانظروا من انا ثم ارجعوا الی انفسکم و عاتبوھا فانظروا ھل یحل لکم قتلی و انتھاك حرمتی۔

"ذرا میرا نام و نسب تو بتلاؤ۔ ذرا دیکھو تو کہ میں کون ہوں؟ پھر خود اپنے نفسوں کی طرف رجوع کرو۔ اپنے گریبانوں میں منہ ڈالو، اور خود اپنے آپ سے جواب دہی کرو۔ غور کرو کہ تمھارے لیے میرا خون بہانا اور میری ہتک حرمت کرنا جائز ہے؟"

الست ابن بنت نبیکم و ابن وصیہ و ابن عمہ و اوّل المؤمنین باللہ والمصدق لرسولہ بما جاء بہ من عند ربہ۔ "کیا میں نہیں ہوں تمھارے نبیؐ کا نواسا اور ان کے وصی ان کے چچا زاد بھائی اور ان کے اوپر سب سے پہلے ایمان لانے والے اور تصدیق کرنے والے کا فرزند۔"

او لیس حمزۃ سید الشھداء عم ابی کیا حمزہؑ جنھیں متفق طور پر سید الشھدا کہتے ہیں وہ میرے باپ کے حقیقی چچا نہیں تھے؟ او لیس جعفر

الشہید الطیّار ذوالجناحین عمّی ۔" کیا جعفرؓ طیار جنھیں بعوضِ شہادت خدا نے دو پر پرواز عطا کیے، میرے ہی چچا نہیں تھے؟ او لم یبلغکم قول مستفیض فیکم ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم قال لی ولاخی ھذان سیدا شباب اھل الجنۃ ۔" کیا یہ حدیث تمھارے گوش زد نہیں ہوئی جو زبان زدِ خلائق ہے، کہ حضرتِ رسولؐ نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں فرمایا تھا، کہ یہ دونوں جوانانِ اہلِ جنت کے سردار ہیں۔"

فان صدقتمونی بما اقول وھو الحق واللہ ماتعمدت کذبا مذ علمت ان اللہ یمقت علیہ اھلہ و یضر بہ من اختلقہ۔
اگر تم مجھے سچا سمجھتے ہو اور میری بات کو سچ جانتے ہو (اور وہ حقیقتہً سچی ہی ہے۔ اس لیے کہ جب سے میں سنِ تمیز کو پہنچا، کبھی کوئی کلمہ میری زبان سے جھوٹ نکلا ہی نہیں) تو خیر۔"

وان کذبتمونی فان فیکم من ان سألتموہ من ذلک اخبرکم سلوا جابر بن عبداللہ الانصاری او ابا سعید الخدری اوسھل بن سعد الساعدی اوزید بن ارقم او انس بن مالک یخبرکم انھم سمعوا ھٰذہ المقالۃ من رسول اللہ لی ولاخی۔
"اور اگر تم میری بات کو غلط سمجھو تو اسلامی دنیا میں ابھی ایسے اشخاص موجود ہیں کہ اگر تم ان سے دریافت کرو تو وہ تمھیں بتلا دیں گے۔ دریافت کرو جابر بن عبداللہؓ انصاری سے۔ ابو سعید خدری سے سہل بن سعد ساعدی سے، زید بن ارقم سے، انس بن مالک سے۔ یہ تمھیں بتائیں گے کہ انھوں نے اپنے کانوں سے رسالت مآبؐ کو یہ حدیث فرماتے ہوئے سنا افما فی ھٰذا حاجز لکم عن سفک دمی۔
"کیا رسالت مآبؐ کی یہ حدیث تم کو میری خونریزی سے روکنے کے لیے کافی

نہیں ہے؟"

فان کنتم فی شک من ھٰذا القول افتشکون الی ابن بنت نبیّکم فو اللہ ما بین المشرق و المغرب ابن بنت نبیّ غیری منکم ولا من غیرکم انا ابن بنت نبیکم خاصۃ۔

"اچھا۔ اگر اس حدیث میں تم کو شک ہے کہ میں تمھارے رسولؐ کا نواسا ہوں خدا کی قسم مشرق و مغرب عالم میں کسی نبی کا نواسا میرے سوا کوئی نہیں ہے بس میں ہی ہوں جو خاص تمھارے نبیؐ کا نواسا ہوں۔ یعنی یہودیوں کے نبی کا نہیں، نصاریٰ کے نبی کا نہیں۔ خاص تم مسلمانوں کے نبیؐ کا نواسا ہوں۔"

اخبرونی اتطلبونی بقتیل منکم قتلتہ او مال لکم استھلکتہ اوبقصاص من جراحۃ - ذرا بتاؤ تو سہی کہ میرے قتل پر کیوں آمادہ ہوئے ہو؟ کیا کسی اپنے مقتول کا بدلہ لیتے ہو جو میرے ہاتھ سے قتل ہوا ہے؟ یا کسی مال کا اپنے مطالبہ کرتے ہو جسے میں نے تلف کر دیا ہے یا کسی زخم کا قصاص چاہتے ہو؟"

ایک خاموشی سی چھائی رہی اور کسی نے کچھ جواب نہ دیا۔ جس کے بعد حضرتؑ نے خاص طور سے شیث بن ربعی، حجار بن ابجر، قیس بن اشعث یزید بن حارث کو آواز دی اور فرمایا۔ الم تکتبوا الی ان قد اینعت الثمار واخضر الجناب ولھمنت الاجام وانما تقدم علی جند لک مجند۔

"کیا تم نے مجھے نہیں لکھا تھا کہ میوے پختہ و رسیدہ ہیں۔ کھیتیاں لہک رہی ہیں۔ چشمے پُرآب ہیں۔ لشکر آپ کی مدد کے لیے تیار ہیں۔"

ان لوگوں نے (یہ جرأت دیکھنے کے قابل ہے) پکار کر کہا۔ "ہم نے تو نہیں لکھا تھا۔"

حضرتؑ نے فرمایا۔

سبحان اللہ بلی واللہ لقد فعلتم ۔" یوں انکار کرنے کو انکار کرو مگر خدا کی قسم تم نے لکھا تھا، اور ضرور لکھا تھا"۔

پھر حضرتؑ عام لشکر کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا:

"ایھا الناس اذکرھتمونی فدعونی انصرف عنکم الی مأمنی من الارض ۔جب تمھیں میرا آنا ناگوار ہے تو مجھے واپس چلا جانے دو۔ ایسی جگہ جہاں میں امن وامان سے زندگی کے دن بسر کرسکوں"۔

(یہ وہی مطالبہ ہے جو حضرت نے حُرؓ کی فوج کے سامنے کیا تھا اور وہی آج پیش ہو رہا ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ امام حسینؑ کا مسلک امن وامان کی حفاظت اور جنگ سے کنارہ کشی کا جو پہلے تھا وہ برابر قائم رہا۔ نہ تو بعد کے حالات سے مشتعل ہوکر اس مسلک سے ہٹے اور نہ یہی ہے کہ بعد کے حالات سے مجبور ہوکر موت کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر اس مسلک کو آپ نے اب اختیار کیا ہے)

قیس ابن اشعث نے (یہ محمد ابن اشعث کا بھائی ہے اور جعدہ بن اشعث اس کی بہن، جعدہ وہ کہ جو امام حسنؑ کو زہر خورانی کی براہِ راست ذمہ دار اور محمد بن اشعث وہ کہ جو حضرت مسلمؑ کی مخالف فوج کا سردار اور آپ کی گرفتاری کا بانی اور قتل کا ذمہ دار یہ قیس انہی دونوں بھائی بہن کا بھائی ہے) پکار کر کہا۔" تو کیوں آپ یزید کی بیعت نہیں کرلیتے"؟

حضرتؑ نے فرمایا۔" ہاں کیوں نہ ہو، تو اسی اپنے بھائی کا تو بھائی ہے جس نے مسلمؑ کو قتل کیا ہے۔" لا واللہ لا اعطیھم بیدی اعطاء الذلیل ولا اقرا فرار العبید عباد اللہ انی عذت بربی وربکم ان ترجمون اعوذ بربی وربکم من کل متکبر لا یومن بیوم الحساب۔

"خدا کی قسم یہ تو نہ ہوگا کہ میں اپنے کو ذلت کے ساتھ اس کے سپرد کردوں اور غلامانہ زندگی کا اپنے لیے اقرار کرلوں۔ یہ ناممکن ہے، میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میرے دامن پر کوئی دھبہ آئے۔ میں پناہ مانگتا ہوں ہر اس جابر و سرکش سے جو روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔"

حجت تمام ہو چکی اور تقریر ختم ہوئی۔ حضرت نے عقبہ بن سمعان رضؓ سے فرمایا کہ ناقہ کو باندھ دو۔ آپ ناقہ سے اُتر آئے اور وہ باندھ دیا گیا۔[۱]

دیکھتے امام حسینؑ جس اصول پر ابتدا سے قائم تھے اسی پر آخر تک قائم رہے۔ آپ نے یہ کہا کہ مجھ کو کسی طرف چلا جانے دو۔ مجھ کو پہاڑوں کی طرف نکل جانے دو۔ مگر کوئی بات منظور نہ ہوئی۔ سوال تھا اور بس ایک کہ "اپنے تئیں ابن زیاد کے سپرد کر دیجئے۔ یزید کی بیعت کر لیجئے۔" وہ کہ جسے حسینؑ مذہب کی پامالی سمجھتے تھے۔ اس کو حسینؑ نے گوارا نہ کیا۔ یہ چیز ایسی تھی جس نے نمایاں طور پر ظاہر کر دیا کہ آپ کے خلاف جو جماعت ہے وہ بالکل سختی پر آمادہ ہے۔ اس کو اخلاق اور شائستگی سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ وہ چیز ہے جس نے ایسے لوگوں پر بھی اثر ڈالا جو حسینؑ کے مخالف تھے۔ اور بعض نیک بندے ایسے متاثر ہوئے کہ انھوں نے یزید کے لشکر سے کنارہ کشی کر لی اور امامؑ کا ساتھ دیا۔ جیسے حُرؓ بن یزید ریاحی۔ وہی حُرؓ جو کل امامؑ کے لیے سدِّ راہ بنا تھا۔ اور گھیر کر کربلا لایا تھا۔ آج وہ ضمیر کی ہدایت سے مجبور ہوتا۔ اور ابن سعد کی ہمراہی ترک کر دیتا ہے جو چیز اس پر سب سے زیادہ اثر ڈالنے والی تھی۔ وہ انہی امام حسینؑ کے صلح پسندانہ مطالبات کا مسترد ہو جانا۔ جیسا کہ تاریخ میں ہے جس وقت لشکر صف آرا ہو چکا تو حُرؓ عمر سعد کے پاس آیا اور کہا مقاتل انت ھذا الرجل۔

---

[۱] طبری۔ ج ۶ ص ۲۴۲، ص ۲۴۳۔

"کیا تم اس شخص (حسینؑ) سے واقعی جنگ کرو گے"؟
عمر سعد نے کہا۔ ای واللہ قتالا ایسرہ ان تسقط الرؤس
وتطیح الایدی۔
"بے شک، ایسی سخت جنگ جس کا معمولی نتیجہ یہ ہے کہ سروں کی بارش
ہو اور ہاتھ کٹ کٹ کے زمین پر گرتے ہوں"
حُرؒ نے کہا۔ فما لکم فی واحدۃ من الخصال التی عرض علیکم
رضا۔
"کیوں یہ اتنے مطالبے حسینؑ نے پیش کیے۔ ان میں سے کوئی تمہاری
منظوری کے قابل نہیں ہے"۔
اس نے کہا۔ واللہ لو کان الامر الی لفعلت ولکن امیرک قد ابیٰ
ذالک۔
"خدا کی قسم اگر معاملہ میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں منظور کر لیتا۔ مگر میں کیا
کروں تمہارا حاکم (ابن زیاد) نہیں مانتا"۔
حُرؒ عمر سعد سے گفتگو کو بیکار سمجھ کر اس سے علیحدہ ہوا۔ قرہ بن قیس حُر کے
قبیلہ کا شخص اس کے ساتھ تھا۔ اس کو یہ کہہ کر اپنے پاس سے ٹالنا چاہا کہ "قرہ!
تم نے آج اپنے گھوڑے کو پانی نہیں پلایا؟" قرہ نے کہا۔ "ابھی پلائے لاتا
ہوں"۔ وہ گھوڑے کو پانی پلانے گیا اور حُر آہستہ آہستہ حسینؑ کے لشکر سے نزدیک
ہونے لگا۔ مہاجر بن اوس جواہنی کے قبیلہ کا ایک دوسرا شخص تھا۔ اس نے کہا۔
کیوں کیا حملہ کرنے کا ارادہ ہے؟ حُر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جسم میں لرزہ
کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔
مہاجر نے کہا۔ "حُرؒ یہ تمہاری کیا حالت ہے؟ اگر مجھ سے پوچھا جاتا کہ کوفہ
کے لوگوں میں سب سے زیادہ بہادر کون ہے؟ تو میں تمہارے سوا کسی کا نام نہ
لیتا۔ پھر یہ جو میں اس وقت دیکھ رہا ہوں یہ کیا ہے"؟

حُر نے کہا، "میرے سامنے اس وقت جنت اور دوزخ کا سوال پیش ہے۔ خدا کی قسم میں تو جنت کے اوپر کسی چیز کو مقدم نہیں سمجھتا ہوں۔ چاہے میرے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور مجھے آگ میں جلا دیا جائے۔" یہ کہتے کہتے گھوڑے کو چابک لگایا اور آنِ واحد میں حسینی لشکر میں پہنچ گیا۔[1]

ایک دوسرا مجاہد یزید بن زیاد بن مہاجرؒ۔ اس کے متعلق تاریخ میں یہ ہے کان ممن خرج مع عمر بن سعد الی الحسین فلما ردوا الشروط علی الحسین مال الیہ فقاتل معہ حتی قتل۔ " یہ بھی عمر سعد کی فوج میں اس کے ساتھ آئے تھے۔ لیکن جب امام حسینؑ کے مطالبات کو نامنظور کیا گیا تو یہ امام حسینؑ کی طرف متوجہ ہوئے اور آپ کی حمایت میں جنگ کی یہاں تک کہ شہید ہوئے۔[2]

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام حسینؑ کے طرزِ عمل میں صلح پسندانہ پہلو اس درجہ نمایاں تھا جس کا دشمنوں پر اثر پڑ رہا تھا اور وہ آپ کے ہمدرد بن رہے تھے۔

آپ اپنے طرزِ عمل سے برابر یہ ثابت کرتے رہے کہ میں اپنی طرف سے جنگ کرنا نہیں چاہتا۔ اس وقت کہ جب امامؑ خاموشی کے ساتھ اپنے خیمہ کے دروازہ پر کھڑے تھے اور خیمہ کی پشت پر خندق میں آگ بھڑک رہی تھی، ایک سوار سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق اس طرف سے گزرا اور خیموں کے اوپر نظر ڈالی تو چاروں طرف ان کے آگ مشتعل نظر آئی۔ اس نے پکار کر انتہائی سخت الفاظ میں ایک جملہ کہا، جسے سن کر اصحاب بے چین ہو گئے۔ امامؑ نے فرمایا۔ "یہ کون ہے؟ غالباً شمر بن ذی الجوشن ہے۔" اصحاب نے عرض کیا۔ "ہاں فرزندِ رسولؐ! یہ وہی ہے۔" حضرتؑ نے فرمایا۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۴ [2] طبری۔ ج ۶ ص ۲۵۵۔

"جہنم کی آگ میں جلنے کا مستحق تو ہے۔"

مسلم بن عوسجہ نے جو نہایت ضعیف العمر ہو چکے تھے۔ مگر جملہ ایسا تھا کہ تمام اصحاب میں جوش پیدا ہو گیا تھا۔ عرض کی جعلت فداك الا ارمیه بسهم فانه قد امكننی و لیس یسقط سهم فالفاسق من اعظم الجبارین"۔ "میری جان آپ پر نثار۔ اجازت ہوتی ہے کہ ایک تیر مار دوں؟ اس وقت یہ بالکل زد پر آگیا ہے، تیر خطا نہیں کرے گا، اور آدمی بڑا فاسق و فاجر ہے۔"

حضرت نے فرمایا۔ لا ترمه فانی اکره ان ابدأهم۔ "نہیں ایسا نہ کرنا۔ میں جنگ میں ابتدا نہیں کرنا چاہتا"۔[1]

تاریخ ان واقعات سے مملو ہے۔

دنیا میں جنگ کا قاعدہ تھا، لڑائی کا عام قانون تھا کہ بڑے سے بڑے بہادر اور شہسوار بھی جنگ میں زرہ پہنتے تھے۔ امیر المومنینؑ جن کی شجاعت کا دنیا میں سکہ قائم ہے وہ بھی جنگ میں زرہ پوش ہوتے تھے۔ ہاں اتنا ہے کہ آپ کی زرہ بس سامنے کے رُخ پر تھی۔ اور پس پشت کی طرف نہ تھی، رسالت مآبؐ جو تمام صفات حتیٰ کہ شجاعت میں بھی افضلِ خلق تھے، وہ بھی زرہ ضرور پہنتے تھے (حضرت عباسؓ بن المطلبؓ اور امیر المومنینؑ کا ایک ظاہری اختلاف میراث نبیؐ کے متعلق جو پیدا ہو گیا تھا اس میں زرہ کا تذکرہ موجود ہے)

مگر کربلا میں حسینؑ کو اتنا بڑا معرکہ سر کرنا تھا۔ اتنی عظیم جنگ کرنا تھی اور تاریخ میرے سامنے ہے۔ اس میں یہ ہے کہ آپ صرف ایک کرتا پہنے ہوئے تھے خز کا (خز ایک باریک کپڑا ہے جو ریشم کی طرح کا ہوتا ہے) اور سر پر عمامہ باندھے تھے جس کو لڑنا منظور ہوتا ہے وہ یونہی میدان جنگ میں آتا ہے؟

اصحاب بھی کس کے اصحاب تھے؟ وہ بھی اپنے اخلاق، اپنی تہذیب، اپنی

---

[1] طبری۔ ج ۶ ص ۲۴۲۔

[2] طبری۔ ج ۶ ص ۲۵۹

شائستگی میں بالکل اپنے رہنما کے قدم بقدم تھے۔ وہ بھی اسی طرح تبلیغ، اتمامِ حجت کے فرائض کو ادا کر رہے تھے جیسے ان کا امامؑ۔

دنیا میں ہزاروں لڑائیاں ہوئی ہیں۔ ہزاروں واقعات پیش آئے ہیں لیکن کسی رئیس کسی سالارِ فوج کے ساتھی۔ اس طرح اس کے ہر قول، ہر ہدایت، ہر دلی منشاء کے مطابق عامل نہیں رہے ہیں جس طرح حسینؑ کے ساتھی۔ چنانچہ اس موقع پر جب امام حسینؑ وہ تقریر فرما چکے جس کا تذکرہ ہم نے سابق میں کیا ہے تو زہیرؓ بن قین صف سے باہر نکلے۔ گھوڑے پر سوار، سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق۔ مگر کیا جنگ کے لیے باہر آئے ہیں ؟ نہیں۔ صرف ہدایت اور اتمامِ حجت کے لیے، خطاب کیا افواجِ اہلِ کوفہ سے

یا اھل الکوفۃ نذار لکم من عذاب اللہ نذار ان حقاً علی المسلم نصیحۃ اخیہ المسلم ونحن حتی الأن اخوۃ وعلی دین واحد وملّۃ واحدۃ مالم یقع بیننا وبینکم السیف وانتم النصیحۃ منّا اھل فاذا وقع السّیف انقطعت العصمۃ وکنا امّۃ وانتم امّۃ۔

"اے کوفہ کے لوگو! میں تم کو ڈراتا ہوں خدا کے عذاب سے اور تم کو اس سے ڈرنا چاہیے۔ ایک مسلمان پر حق ہے دوسرے مسلمان کا کہ وہ اسے نصیحت کرے۔ ہم ابھی تک آپس میں بھائی بھائی ہیں ایک ہی مذہب اسلام کے پیرو اور ایک ہی ملّت نبویہ کے تابع ہیں مگر اس وقت تک کہ جب تک ہمارے تمہارے درمیان تلوار نہیں چلی ہے اور اس وقت تک تم ہماری طرف سے نصیحت کے بھی مستحق ہو۔ ہاں بے شک جس وقت شمشیر زنی کی نوبت آگئی بس اس وقت حقوقِ اسلامی کی حفاظت کا سلسلہ ختم اور ہم ایک امت

اور تم دوسری امت ہو گئے۔"

ان اللہ قد ابتلانا وایاکم بذریۃ نبیہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لینظر ما نحن وانتم عاملون انا ندعوکم الی نصرھم وخذلان الطاغیۃ عبید اللہ بن زیاد فانکم لا تدرکون منہما الا بسوء عمر سلطانہما کلہ لیسملان اعینکم ویقطعان ایدیکم وارجلکم ویمثلان بکم ویرفعانکم علی جذوع النخل ویقتلان اماثلکم وقراءکم امثال حجر بن عدی واصحابہ وھانی بن عروۃ واشباھہ۔

"دیکھو خدا نے ہماری بھی آزمائش کی ہے اور تمہاری بھی، اپنے نبیؐ کی اولاد کے ذریعہ سے تاکہ وہ دیکھے ہمارا کیا طرزِ عمل ہوتا ہے اور تمہارا کیا؟ ہم تم کو دعوت دیتے ہیں، ان کی مدد اور عبید اللہ بن زیاد کا ساتھ چھوڑنے کی طرف، دیکھو، یزید اور ابن زیاد سے تم ان کی مدتِ سلطنت بھر سوائے برائی کے کوئی اچھا سلوک نہ پاؤ گے وہ تمہاری آنکھوں میں سلائیاں پھرواتے اور تمہارے ہاتھ پاؤں قطع کرتے اور تم کو مثلہ کرتے اور تم کو سولیوں پر چڑھاتے ہیں اور وہ تمہارے اچھے اچھے اشخاص اور حفاظ قرآن کو جیسے حجرؓ بن عدی اور ان کے ساتھی اور ہانی بن عروہؓ وغیرہ کو قتل کرتے رہتے ہیں۔"

کوفہ والے خوشامدی لوگوں نے ابن زیاد کی تعریف کرنا شروع کر دی۔ اور کہا "ہم تمہارا کہنا کبھی نہیں مانیں گے، بلکہ تم کو اور ان کو جو تمہارے امامؑ ہیں قتل کر کے ہی دم لیں گے۔"

زہیرؓ اس کے بعد بھی خاموش نہ ہوئے۔ اور ہدایت کرتے رہے مگر شمر بن ذی الجوشن نے تیر لگایا اور کہا "بس خاموش رہو، خدا تمہاری زبان کو خاموش کرے۔"

زہیرؓ نے تیر کے آنے کی پروانہ کی۔ نشانہ کو خالی دیا۔ مگر سلسلۂ تقریر کو قطع ہونے نہیں دیا۔ امام حسینؑ نے یہ دیکھ کر کہ بات کا جواب تیر سے دیا جا رہا ہے، زہیرؓ کے لیے خطرہ کا احساس فرمایا۔ اور کہلوایا۔ اقبل فلعمری لئن کان مؤمن آل فرعون نصح لقومہ وابلغ فی الدعاء لقد نصحت ھٰولآء و ابلغت لو نفع النصح والابلاغ۔

"بس اب واپس چلے جاؤ۔ اگر مومن آلِ فرعون نے اپنی قوم کو نصیحت کر دی تھی اور اپنی ذمہ داری کو پورا کر دیا تھا تو تم نے بھی انکی نصیحت میں کوتاہی نہیں کی لیکن نصیحت و تبلیغ سے کوئی فائدہ بھی تو ہو۔"

زہیرؓ واپس آ گئے[1]

اب تک اتمام حجت کی منزلیں تھیں، اب تک اصلاح کی کوششیں تھیں لیکن دھوپ چڑھ چکی ہے۔ دن کا کچھ حصہ گزر چکا ہے۔ عمر سعد نے لشکر کو آگے بڑھایا درید کو آواز دی۔ "علم اپنا قریب لا۔" درید علمبردار لشکر تھا۔ رایت جنگ کو قریب لایا عمر سعد نے تیر اپنا چلہ کمان میں جوڑا۔ فوج حسینی کی طرف رہا کیا اور کہنے لگا۔ اشھدوا انی اول من رمی۔

"گواہ رہنا کہ سب سے پہلا تیر میں نے لگایا ہے"[2]

بس یہ تھا آغازِ جنگ، رواداری کا دور ختم ہوا، صلح کے مواقع باقی نہیں رہے اب حسینؑ ہیں اور استقلال، ثابت قدمی ہے اور پرجگری۔ حمایتِ باطل سے علیحدگی، بات پر مرمٹنا۔ اب یہ ثابت کرنا ہے کہ "ہم جان دیں گے مگر فاسق و فاجر کی بیعت نہ کریں گے۔ دنیا سے اپنی ہستی کے فنا ہونے پر راضی ہو جائیں گے۔ مگر اسلام کے فنا ہونے پر راضی نہ ہوں گے۔"

بیعت کا سوال جب ہوا حسینؑ نے یہی کہا کہ موت بیعت سے بہتر ہے۔

---

[1] طبری۔ ج ۶ ص ۲۴۳، ص ۲۴۴۔ [2] طبری۔ ج ۶ ص ۲۴۵۔

راستہ میں جب حُرؒ کہتا ہوا جا رہا تھا۔ "دیکھیے اپنے اوپر رحم کیجیے میں دیکھتا ہوں کہ آپ قتل ہو جائیں گے"۔ تو آپ نے فرمایا تھا۔

افبالموت تخوفنی وھل یعدو بکم الخطب ان تقتلونی ما ادری ما اقول لک ولکن اقول کما قال اخوالاوس لابن عمہ ولقیہ وھو یرید نصرۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و الہ وسلم فقال لہ این تذھب فانک مقتول فقال۔

سامضی وما بالموت عار علی الفتیٰ
اذا ما نویٰ حقا وجاھد مسلما

"کیوں حُرؒ تو مجھ کو موت سے ڈراتا ہے؟ سب سے زیادہ جو بات تمہارے ہاتھ میں ہے، وہ یہی تو کہ مجھے قتل کر ڈالو! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تجھے کیونکر سمجھاؤں۔ لیکن میں وہ کہتا ہوں جو قبیلۂ اوس کے شخص نے کہا تھا جب وہ رسالت مآبؐ کی مدد کو جا رہا تھا۔ اور اس کے بھائی نے کہا تھا "کہاں جاتا ہے تو قتل ہو جائے گا۔" تو اس نے کہا۔ "میں جاؤں گا اور ضرور جاؤں گا، اور موت میں کوئی ننگ و عار نہیں ہے، جوانمرد کے لیے جب وہ حق پر قائم رہے اور حق پر جان دے دے[1]"

وہ تو صلح پسندی کا اظہار تھا، اسلام کی تعلیم کا ثابت کرنا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو وہاں تک جنگ سے علیحدہ رہو، ورنہ حسینؑ موت سے خوف تھوڑی رکھتے تھے وہ اس باپ کے بیٹے تھے جس کا قول تھا کہ "مجھ کو پرواہ نہیں، میں موت کی طرف جا رہا ہوں۔ یا موت میری طرف آرہی ہے"۔ وہ اس باپ کے

---

[1] طبری۔ ج ۶ ص ۲۲۹۔

بیٹے مجھے جو کہنا تھا۔ "علیؑ کو موت سے اتنی محبت ہے جتنی کسی دودھ پیتے بچہ کو اپنی ماں کی آغوش سے محبت ہوتی ہے۔"

حسینؑ نے بھی اپنے عمل سے اس کو ثابت کر دیا۔ وہ تو وہ ان کے بچے اسی اصول پر قائم تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ انسان کے لیے حق پر قائم رہنا ہزار زندگیوں سے بہتر ہے۔

راستے کا واقعہ ہے۔ جب حضرتؑ قصر بنی مقاتل سے آگے بڑھے ہیں ایک جگہ آپ کی آنکھ لگ گئی ہے۔ چونکے تو زبان پر یہ کلمہ تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون والحمد للہ رب العالمین۔ شاہزادہ علی اکبرؑ نے عرض کیا۔ "کیوں بابا کیا ہے"؟ حضرتؑ نے فرمایا۔

"میں نے خواب میں دیکھا، ایک سوار ہے جو کہہ رہا ہے کہ یہ لوگ تو جا رہے ہیں اور موت ان کے عقب میں ہے۔" میں نے سمجھا کہ یہ ہمارے موت کی خبر دیتا ہے۔" شاہزادہ نے کہا۔ کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟

آپ نے فرمایا۔ "کیوں نہیں۔"

شاہزادہ نے کہا۔ "بابا پھر ہمیں موت کی کیا پروا۔ موت آئے گی تو حق پر آئے گی۔"

امامؑ خوش ہو گئے۔ فرمایا :

جزاک اللہ من ولد خیر ما جزی ولدا عن والدہ۔

"خدا تمھیں جزائے خیر دے۔ بہترین بدلہ جو کسی فرزند کو اس کے باپ کی طرف سے دیا جاتا ہو۔"[1]

یہ تھا وہ جوہر جو آخر وقت تک آپ کے طرز عمل میں نمایاں تھا۔ آپ کے

---

[1] طبری۔ ج ۶ ص ۲۳۱، ص ۲۳۲۔

اصحاب کے طرزِ عمل میں نمایاں تھا۔ آپ کے اعزا کے طرزِ عمل میں نمایاں تھا۔
میدانِ جنگ میں ہزاروں مصائب کے سیلاب تھے جو آرہے تھے۔ اور وہ کوہِ عزم و استقلال تھا جس سے ٹکرا کر وہ خود پاش پاش ہو جاتے تھے۔ مجھے دلدوز واقعات کا تذکرہ منظور نہیں۔ وہ ہر شخص کے دل پر لکھے ہوئے ہیں اور ہر شخص کے سامنے پیش نظر ہیں۔
گویا ان تمام مصائب کے ہجوم میں ان سخت سے سخت تکالیف میں حسینؑ کی زبان تھی اور اس پر یہ کلمہ جاری تھا۔

ان کان دین محمد لم یستقم الا بقتلی یا سیوف خذینی

"اگر میرے نانا کا مذہب اس وقت تک برقرار نہیں رہ سکتا جب تک میری رگِ حیات قطع اور میری زندگی ختم نہ ہو جائے تو اے خون آشام تلوارو آؤ۔ یہ جسم تمہارے لیے موجود ہے اسے لے لو۔"

واقعات سخت سے سخت ہوتے جاتے تھے۔ اصحابؓ برابر نصرت کرتے رہے، امامؑ کی حمایت کا جو حق تھا ادا کر دیا۔ دنیا میں ایسے ثباتِ قدم کا نمونہ اور ایسے استقلال کا مظاہرہ آج تک نہیں ہوا ہے۔ تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ تیس ہزار آدمی ایک طرف اور بہتر آدمی ایک طرف اور اس پر جس ثبات و استقلال کے ساتھ انھوں نے جنگ کی ہے جس طرح اطمینانِ قلب کے ساتھ خوش خوش چہروں کے ساتھ، بشاش بشروں کے ساتھ قائم رہے اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔

انھیں یہ احساس تھا کہ ہم زخم نہیں کھا رہے ہیں بلکہ ہم خود زندہ ہو رہے ہیں، اور مذہب کو زندہ کر رہے ہیں۔ اس لیے وہ خوش تھے انھیں کوئی اضطراب نہ تھا۔

امام حسینؑ خیمہ کے اندر ہیں اور عبدالرحمٰنؓ ابن عبد ربہ انصاری اور بریر بن خضیرؓ ہمدانی دروازہ پر بیٹھے ہیں اور بریرؓ عبدالرحمٰنؓ کے ساتھ کچھ مذاق کرتے ہیں۔ عبدالرحمٰنؓ

بگڑ کر کہتے ہیں۔ دعنا فواللہ ما ھذہ بساعۃ باطل۔ "چپ رہو! یہ گھڑی ایسی باتوں کی نہیں ہے"۔ (چونکہ مذاق عام طور پر حقیقت سے الگ ہوتا ہے، اس لیے اسے عام محاورہ میں "باطل" کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے) بریرؓ نے کہا:

"خدا کی قسم میرے قبیلہ کے تمام آدمی جانتے ہیں کہ جوانی سے لے کر بڑھاپے تک کبھی میری طبیعت میں مذاق نہیں رہا۔ مگر عبدالرحمنؓ! اس وقت سے بڑھ کر اور کون وقت خوشی کا ہوگا۔ بس ایک تھوڑی دیر تک دو دو ہاتھ دشمن سے جنگ کرنا ہے اور پھر جنت میں پہنچ جانا ہے مجھے تو جتنی دیر ہوتی ہے وہ طبیعت پر گراں ہے اور دل چاہتا ہے کہ کہیں جلدی سے دشمن کی تلواریں ہم پر برس پڑیں اور ہمارا کام تمام کر دیں [1]"

کیا کہنا ان اصحابؓ کی شجاعت کا۔ کیا کہنا ان کی پُر جگری کا۔

عابسؓ بن ابی شبیب شاکری میدانِ جنگ میں آتے ہیں۔ "الا رجل" "الا رجل" "کیا کوئی مرد نہیں ہے جو میرے مقابلہ کو نکلے"؟

لشکرِ عمر سعد پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ ھٰذا اسد الاسود ھٰذا ابن ابی شبیب لا یخرجن الیہ احد منکم "یہ شیروں کا شیر، یہ عابسؓ بن ابی شبیب ہے، جو اس کے مقابلہ کو جائے گا جان سلامت واپس نہ لائے گا"۔

عمر سعد کا حکم ہوتا ہے، پتھروں کی بارش کر دو (کیا کہنا اس اصولِ جنگ کا، بہادروں کا، مقابلہ اس صورت سے کرنا عرب کی بہادری کے لیے ننگ رہے گا)

ہر طرف سے پتھروں کا مینہ برسا، عابسؓ نے زرہ اتار کر پھینک دی، مغفر اتار کر پٹک دیا، اور اسی طرح دشمن کی فوج میں ڈوب گئے۔

---

[1] طبری۔ ج ۶ ص ۲۴۱۔

یہ ہے شجاعت، اس کا نام ہے جاں نثاری، وہ اپنی اس محدود زندگی کو زندگی ہی نہ سمجھتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ ہم کو ایک لامحدود زندگی حاصل کرنا ہے جہاں تک ممکن ہو اس زندگی کو جلد حاصل کر لیں۔

ایک وہ وقت آیا کہ اصحابؓ میں سے کوئی باقی نہیں رہا۔ اعزّا بھی شہید ہو چکے کوئی نہیں، حسینؑ ہیں اور دشمن کا لشکر چاروں طرف سے ہجوم ہے۔ حملوں پر حملے ہیں۔

بے شک حسینؑ ہیں اور ثباتِ قدم، استقلال ہے اور پامردی، بات پر قائم رہنا ہے۔ اور حمایتِ حق، باطل سے علیٰحدگی ہے اور نصرتِ مذہب۔

اب جنگ کو دیر گزر چکی ہے، واقعات سخت تر ہوتے جاتے ہیں، مصائب کا تذکرہ مجھے منظور نہیں۔ وہ آپ سنا ہی کرتے ہیں۔ مجھے وہی چیزیں بیان کرنا ہیں جن کا میرے موضوعِ بیان سے تعلق ہے۔

فوج عمر سعد کا ایک آدمی بیان کرتا ہے کہ واللہ ما رأیت مکسور اقط قد قتل ولدہ واھل بیتہ واصحابہ اربط جاشا ولا امضیٰ جنانا منہ ولا اجرأ مقدما واللہ ما رأیت قبلہ ولا بعدہ مثلہ۔

"خدا کی قسم، میں نے کوئی دل شکستہ و زخم رسیدہ آدمی جس کے اولاد، بھائی اعزّا، انصار، سب قتل ہو گئے ہوں۔ ایسا نہیں دیکھا جو حسینؑ سے زیادہ مطمئن، مستقل مزاج، ثابت قدم اور باہمت ہو، خدا کی قسم ان سے زیادہ کیا میں نے ان کے قبل اور ان کے بعد ان کے مثل بھی کوئی نہیں دیکھا"[۱]

اس عزم و استقلال کے ساتھ دنیا کو یہ سبق دے رہے تھے کہ دیکھو حق پر

---

[۱] طبری۔ ج ۶ ص ۲۵۹۔

کر ہو تو جان دینے میں مضائقہ نہ کرو۔ ہر چیز کے مقابلہ میں جان عزیز رکھو مگر عزتِ مذہب اور ناموسِ دین ایسی چیز نہیں ہے جس کے مقابلہ میں جان عزیز کی جائے۔

آپ کا نعرۂ شیرانہ ہے جو کربلا کی فضا میں آپ کے دہن سے نکل کر گونجا اور پھر فنا نہیں ہو گیا۔ وہ مردہ قوموں میں حیات پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ وہ ایک جملہ ہے جو کربلا میں آپ کی زبان پر تھا۔ الموت اولیٰ من رکوب العار۔ موت عار و ننگ کے برداشت کرنے سے بہتر ہے" یہ وہ کلمہ ہے جو حیاتِ قومی کا سرنامہ قرار پانے کے قابل ہے۔[1]

حسینؑ نے حق کے لیے کسی چیز کو عزیز نہیں کیا۔ اصحابؓ کو اپنے سامنے رخصت کیا۔ اولاد کو اپنے سامنے قتل ہوتے دیکھا۔

ہو سکتا تھا کہ حسینؑ سب سے پہلے ہی لڑتے اور شہید ہو جاتے، یہ اور بات ہے کہ اصحاب آپ کو روکتے اور گوارا نہ کرتے مگر یہ بھی تو کہیں تاریخ میں نہیں ہے کہ آپ نے چاہا ہو، پہلے خود شہید ہو جائیں، پہلے خود ہی دشمنوں کے تیغ و نیزہ و خنجر کا نشانہ قرار پائیں۔

آپ نے یہ نہیں چاہا۔ سب کو اجازت دے دی۔ عزیز سے عزیز جگر کے ٹکڑوں کو خوشی خوشی اجازت دی۔

بات کیا تھی؟ حسینؑ چاہتے تھے کہ جو کچھ بھی مجھ سے تعلق رکھتا ہے، جو کچھ میری طرف منسوب ہو سکتا ہے۔ جو کچھ میرے خزانہ میں ہے، اس کو اپنے ہاتھ سے لٹا دوں، سب کو اسلام پر نثار کر دوں۔ جب کچھ نہ رہے تو اپنی جان دے دینا تو آسان ہے یہ مرحلہ ختم ہونا کوئی مشکل نہیں ہے۔

نفس کی کمزوری ہوتی اگر آپ اپنی زندگی ختم کرنے پر پہلے ہی تیار ہو جاتے۔ نہیں

---

[1] یہ اور اس کے بعد کا مضمون تفصیل سے رسالہ "حسینؑ اور اسلام" میں درج ہے۔ جو امامیہ مشن پاکستان سے شائع ہو چکا ہے۔

یہ تحمل تھا، یہ قوت برداشت تھی، یہ صبر تھا، کہ چاہتے تھے سب کو میں اپنے ہاتھ سے نثار کر دوں، ساتھیوں کی مفارقت برداشت کروں، عزیزوں کی جدائی کا تحمل کروں، بھائی بیٹے اور اولاد سب کو اپنے ہاتھ سے راہ خدا میں قربان کر دوں۔

سب کے متعلق تو میں مجازاً کہتا ہوں کہ حضرتؑ نے اپنے ہاتھ سے اسلام پر فدا کیا۔ مگر وہ شہید جو خود میدانِ جنگ میں آنے کے قابل نہ تھا۔ اسے حقیقتاً اپنے ہاتھ سے لاکر فدیۂ اسلام کیا۔

جب سب کو اسلام کی نصرت میں نثار کر دیا تو اس کے بعد اپنی نوبت آئی۔ اپنے اعضاء و جوارح تیغ و خنجر کے حوالہ کیے، اپنا خون اسلام کی نذر کیا۔ جسم کے تمام حصّے اس طرح نصرتِ دین میں صرف کیے کہ ایک ایک زخم پر کئی کئی زخم پڑ گئے۔

جب کچھ نہ باقی رہا اس وقت وہ روح و بدن کا اتصال، وہ آخری علاقہ جس پر نفس کی آمد و شد کا انحصار، زندگی کا دار و مدار ہے، اپنا سر بھی راہِ خدا میں پیش کر دیا۔

حسینؑ اپنی قربانی کے تمام مراتب منظم صورت سے انجام دے رہے تھے اگر یہ پہلا ہی مرحلہ ابتدائی منزل میں قطع کر دیتے، کہنے کو ہوتا کہ مصائب سے گھبرا کر اپنی جان دے دی لیکن آپ نے آہستہ آہستہ قربانی کے منازل کو طے کیا۔ تاکہ یہ کہنے کو نہ ہو۔ آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ کا اقدام کسی وقتی جذبہ کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ عقل و تدبر پر مبنی اور کامل صبر و سکون کے ساتھ مکمل نظم و ترتیب کا نتیجہ ہے۔

مذکورہ بالا واقعات کا نتیجہ
یا
اس سبق کا خلاصہ

موجودہ زمانہ میں اگر قومی حالت پر نظر کی جائے، اگر افراد کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ قوم کی ایک بہت بڑی کمزوری اور ایک بہت بڑا مرض یہ ہے کہ قومیت کا کا صحیح احساس نہیں۔ غیروں کے ساتھ تو درکنار اپنوں کے ساتھ بھی رواداری کے جذبات فنا ہوگئے ہیں۔ یہ افتراق۔ یہ اختلاف، روزمرہ کی لڑائیاں، روزمرہ کے تنازعات جن سے کوئی جماعت مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہ کاہے کا نتیجہ ہیں؟ یہ صرف رواداری نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔ ہر ایک اپنے اغراض و مفاد کے سامنے دوسرے کے اغراض کو پامال کردینے کے لیے تیار۔ اپنے مطلب کے لیے ہر ایک کو نقصان پہنچانے پر آمادہ یہ خودغرضی، یہ مطلب پروری جس سے افراد کے درمیان محبت کے جذبات کمزور اور قومیت کا شیرازہ روز بروز زیادہ منتشر ہوتا جاتا ہے۔

اس کے بعد جوشِ عمل باقی نہیں رہا۔ ایک طرف رواداری مفقود، دوسری طرف جوشِ عمل مفقود، رواداری نہیں، اس لیے لڑیں گے۔ دوسرے کی ترقی و بہبودی میں روڑے اٹکائیں گے۔ خود جوشِ عمل نہیں اس لیے اپنی ترقی و بہبودی کا کوئی سامان نہ کریں گے۔ کاش جوشِ عمل کی کمزوری کے پردہ ہی میں رواداری پیدا ہوئی ہوتی۔ لیکن ایسا بھی نہیں۔ اس لیے نہ کوئی انفرادی ترقی حاصل ہوتی ہے نہ اجتماعی۔ انفرادی اس لیے نہیں کہ وہ قوتِ عمل پر موقوف ہے۔ اور اجتماعی اس لیے نہیں کہ وہ شیرازۂ قومی کے اجتماع پر مبنی ہے جو رواداری

پر موقوف، آئین پسندی جس بات کو حق سمجھ لینا اس پر مرٹنا۔ یہ چیزیں وہ ہیں جو ارتقائے قومی کا حقیقی رمز ہیں مگر جوش اور قوتِ عمل کے کمزور ہونے سے یہ جوہر بھی کمزور ہو جاتے ہیں۔ ثابت قدمی باقی نہیں رہتی۔ استقامت کا وجود نہیں رہتا، استقلال کا پتہ نہیں ملتا۔ دعادی رہتے ہیں جن کا ثبوت مفقود ہو جاتا ہے اگر واقعہ کربلا سے دنیا صحیح سبق حاصل کرلے، اگر حقیقتہً سید الشہدا ؑ نے کربلا میں جو اسوۂ حسنہ پیش کیا اس کو اتنا سمجھ لے کہ اس پر عمل پیرا ہو سکے تو قوم میں زندگی کے آثار نمایاں ہو جائیں، قوم میں تمام وہ خصوصیات پیدا ہو جائیں جو ایک قوم کے حقیقی ارتقاء کا جزوِ اعظم ہیں۔

——— ⁂ ———

بات کی صفائی

اور حقیقت کا اعلان

دنیا کے سیاست اندیش اور قیادت پسند افراد جب کسی تحریک کے داعی ہوتے ہیں اور کسی چیز کے محرک تو وہ ان لوگوں کو جنھیں ساتھ لینا چاہتے ہیں۔ طرح طرح کے مواعید سے اپنی حمایت پر آمادہ کرتے اور طرح طرح کے خوش آیند توقعات پیدا کر کے ان کے خواہشات کو جذب کرتے ہیں اور انھیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ فتح و ظفر کی کہانیاں سنائی جاتی ہیں، مال و دولت، جاہ و ثروت کے خواب دکھلائے جاتے ہیں۔ اس طرح اپنے ساتھ لوگوں کو فراہم کیا جاتا ہے اور ان کی ہمتیں بڑھائی جاتی ہیں۔

اپنی کمزوریاں، مایوسیاں، ناامیدیاں ان اشخاص سے مخفی رکھی جاتی ہیں۔ کہ جن سے کام لینا منظور رہے۔ چہ جائیکہ یہ کہنا "تم ہمارا ساتھ چھوڑ دو، تم ہمارے پاس سے چلے جاؤ۔ ہم نہیں چاہتے کہ تم ہماری وجہ سے اپنی جان دو"۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان کے ضمیر کی سچائی اور انسان کی ایمانداری و دیانتداری پر بڑا حرف آتا ہے۔ اس امر سے کہ وہ کسی کو دھوکے میں مبتلا رکھے اور ایک سچے داعیٔ مذہب اور حقیقی رہنما کے لیے ننگ و عار ہے کہ وہ دوسروں کو غلط توقعات قائم کر کے اپنے ساتھ شریک کرے۔ یا کم از کم خاموش رہ کر ان کو عرصہ تک غلط فہمی میں مبتلا رہنے دے۔

امام حسینؑ نے شروع سے آخر تک اس بات کی کوشش کی کہ کوئی ہمارے ساتھ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو اور غلط توقعات کی بناء پر ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہو۔

صرف آخری وقت میں نہیں بلکہ شروع سے! اُس وقت جبکہ ظاہری اسباب کی بناء پر آپ کی دنیاوی کامیابی کی توقع بہت قوی ہو سکتی تھی، اسی وقت سے آپ نے اس امر کی کوشش کی کہ کسی کو غلط فہمی نہ پیدا ہو اور ان ظاہری اسباب سے جو توقعات پیدا ہوتے ہیں ان پر بھروسہ کر کے کوئی ہمارے ساتھ نہ آئے اس لیے آپ برابر حقیقتِ حال سے اور اپنے آخری انجام سے مطلع کرتے رہے اور اعلان فرماتے رہے کہ ہمارا آخری نتیجہ اس سفر میں موت ہے۔

اس وقت جب آپ ابھی مدینہ منورہ سے روانہ بھی نہ ہوئے تھے، اغیار آپ کے ساتھ نہ ہوئے تھے اور خاص اعزا کی جماعت آپ کے ساتھ چلنے پر آمادہ تھی، اس وقت آپ ایسی باتیں کرتے تھے جن سے خود بخود موت کے استقبال کی تیاری کا پتہ چلتا تھا۔

چنانچہ ابوسعد مقبری جو رجب ۶۰ھ میں جب امام حسینؑ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے ہیں، وہاں موجود تھے۔ ناقل ہیں کہ میں نے امام حسینؑ کو دیکھا کہ آپ مسجد نبوی میں تشریف لیے جا رہے ہیں اور دو آدمی دو طرف سے آپ کے بازو تھامے ہوئے ہیں اور آپ ابن مفرغ شاعر کے اس قول کو بطور تمثیل پڑھ رہے ہیں:

لا ذعرت السوام فی فلق الصبح	صغیرا و لا دعیت یزیدا
یوم اعطی من المھابۃ ضیما	والمنایا برصدننی ان احیدا

شاعر نے اپنا نام نظم کیا ہے لیکن آپ کی زبان سے شعر کا مطلب یہ ہے کہ "میرا نام حسینؑ نہیں اگر موت کے خوف سے میں ذلّت کو برداشت کروں اور اس وقت کہ جب موت میری ناک میں رہے میں ہٹ جاؤں۔"

یہ کوئی تقریر نہیں تھی اور نہ کوئی خاص اعلان تھا، مگر سننے والے نے سمجھ لیا اور وہ بیان کرتا ہے کہ فقلت فی نفسی واللہ ماتمثل بھذین البیتین الا لشئ یریدہ۔

"ان اشعار کو سنتے ہی میں نے اپنے دل میں کہا کہ خدا کی قسم ان شعروں کا پڑھنا رمز سے خالی نہیں ہے اور کوئی مقصد آپ کے پیش نظر ہے جبھی یہ شعر اس وقت پڑھ رہے ہیں۔"

اس کے بعد دو دن نہ گزرے تھے کہ آپ مدینہ سے روانہ ہو گئے۔[1]

اب وہ وقت آیا ہے کہ آپ مکہ معظمہ سے روانہ ہونے والے ہیں یہ وہ وقت ہے کہ لوگوں کو بہت خوش آئند توقعات آپ کے متعلق قائم ہو چکے ہیں اس لیے کہ کوفہ عراق کا پایہ تخت اور برڑامرکز ہے امیرالمومنینؑ کا دارالسلطنت رہ چکا ہے اور لوگوں کی نظر میں علیؑ اور اولادِ علیؑ کے دوستوں سے پُر ہے، وہاں سے بارہ ہزار نامے آچکے ہیں کہ آپ آیئے اور ہم آپ کی نصرت میں اپنا خون پسینہ کی طرح بہانے کے لیے تیار ہیں۔ ان خطوط کے بعد حضرت مسلمؑ روانہ کیے جا چکے ہیں، ان کا خط آچکا ہے، کہ اٹھارہ ہزار آدمیوں نے بیعت کی ہے ان سب باتوں کے بعد امام حسینؑ کوفہ کی طرف روانہ ہو رہے ہیں تو عام افراد کا خیال اس سفر کے متعلق کیا ہو سکتا ہے؟ یہی کہ آپ ایسی جگہ جا رہے ہیں جہاں تاج و تخت کے مالک ہوں گے اور بادشاہ تسلیم کیے جائیں گے۔ اس لیے قدرتاً آپ کے ساتھ بہت سے لوگوں کو اس خیال سے ہو جانا چاہیے تھا کہ وہاں جا کر آپ کی سلطنت سے فائدہ اٹھائیں اور نیز چونکہ آپ زرخیز زمین پر جا رہے ہیں، اس لیے وہاں جا کر مالی منافع بھی حاصل کریں۔

اس طرح یقیناً آپ جو کوفہ کی طرف تشریف لے جاتے تو ایک کثیر جماعت جو ایک لشکر کی حیثیت رکھتی ہوتی آپ کے ساتھ ہوتی اور یقیناً شروع شروع تو اگر جنگ کا موقع ہوتا وہ فتح کے توقعات میں آپ کے ساتھ جنگ میں بھی شریک ہوتی۔ لیکن یہ آپ کو منظور نہ تھا۔ آپ نے ضرورت محسوس کی کہ عام لوگوں کے سامنے حقیقت کو واضح فرما دیں اور سب کو بتلا دیں کہ ان کے خوش آیند

---

[1] طبری۔ ج ۶ ص ۱۹۱۔

توقعات سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ آپ نے مکہ معظمہ سے روانگی کے ایک دن قبل عام مجمع میں تقریر فرمائی جس میں بعد حمد وصلوٰۃ کے حسب ذیل الفاظ ارشاد کیے تھے۔

خط الموت علی ولد آدم مخط القلادہ علیٰ جید الفتاۃ وما اولہنی الیٰ اسلافی اشتیاق یعقوب الیٰ یوسف وخیر لی مصرع انا لاقیہ کانی انظر یا وصالی تقطعہا عسلان الفلوات بین النواویس وکربلاء فیملئن منی اکراشا جوفا واجربۃ سغبا لا محیص عن یوم خط بالقلم رضا اللہ رضانا اہل البیت نصبر علیٰ بلائہ توفینا اجر الصابرین لن تشذ عن رسول اللہ لحمتہ بل ھی مجموعۃ لہ فی حظیرۃ القدس تقربہم عینہ وینجز بہم وعدہ من کان باذلا فینا مھجتہ وموطنا علیٰ لقاء اللہ فلیرحل معنا فانی راحل مصبحا انشاء اللہ۔

"موت اولادِ آدمؑ کے گلے کا ہار ہے میں کتنا اپنے اسلاف کی ملاقات کا مشتاق ہوں، اتنا، جتنا یعقوبؑ، یوسفؑ کی ملاقات کے مشتاق تھے میرے لیے بہتر سے بہتر وہ جگہ ہوگی جہاں میں قتل کر کے گرایا جاؤں (یہ خبریں تھیں جو سینہ بسینہ رسولؐ سے پہنچی تھیں، جن کی بنیاد پر آپ اپنے مستقبل کی خبر دے رہے تھے) میرے پیش نظر ہے وہ منظر جب میرے جوڑ بند وحشی درندے قطع کر رہے ہوں گے، مقام نواویس اور کربلا کے درمیان میں وہ مجھ سے اپنی پیاس بجھا رہے ہوں گے اور اپنی حسرتیں میرے قتل سے نکال رہے ہوں گے، کوئی چارہ کار نہیں ہے کوئی مفر نہیں

ہے اس دن سے جو قلم تقدیر نے لکھ دیا ہے، جو خدا کی مرضی ہو اسی میں ہم اہلِ بیتؑ کی مرضی ہے۔ ہم اس کی آزمائش پر صبر کرتے ہیں اور جو صابرین کا اجر ہے اس کو پورا پورا حاصل کرتے ہیں۔ رسالت مآبؐ سے ان کے جگر کے ٹکڑے دور تھوڑی ہو سکتے ہیں۔ بلکہ وہ بارگاہِ قدس میں جنتِ اعلیٰ میں ان کے پاس مجتمع ہونے والے ہیں۔ جس سے ان کی آنکھیں خنک ہوں گی، ان کا وعدہ پورا ہو گا، جو اپنی جان میرے ساتھ فدا کرنا چاہتا ہو اور موت پر کمر باندھے ہوئے ہو وہ میرے ساتھ چلے۔ میں صبح کو انشاء اللہ روانہ ہو جاؤں گا۔"

دیکھئے ان الفاظ کے ساتھ لوگوں کو اپنے ساتھ آنے کی دعوت دی جا رہی ہے کیا اس سے بڑھ کر دنیا میں حقانیت اور سچائی کا ثبوت ہو گا؟ کیا اس سے بڑھ کر صاف گوئی طہارتِ ضمیر کا مظاہرہ ہو گا؟

اب ساتھ چلنے والے وہی لوگ تھے جو جان دینے کے لئے تیار تھے، جو حقیقتاً استقلال اور ثابت قدمی رکھتے تھے، جن کو دنیا کی کوئی توقع اور راحت، دنیا کا کوئی خیال اپنی طرف متوجہ نہیں کر رہا تھا بلکہ وہ حقیقت کے طالب تھے، اور مجاز کے پردوں کو چاک کر کے حقیقت کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔

اس حقیقت پرور تقریر کے بعد وہی لوگ آپ کے ساتھ ہوئے جو دنیا کے مال و دولت، جاہ و حشم کو خاک سیاہ سمجھتے تھے۔ جو زندگی کے طالب تھے اور اسے موت کا نتیجہ سمجھتے تھے، بس وہی آپ کے ساتھ روانہ ہوئے۔ منتخب مجمع چھٹے ہوئے لوگ، یہ طریقہ تھا امامؑ کے انتخاب کا اور اس طرح آپ نے چاہا تھا کہ حشو و زوائد آپ کے ساتھ نہ ہونے پائیں، وہی آئیں جو موت کے والہ و شیفتہ ہوں۔

یہ تقریر مکہ معظمہ کی تھی جس نے ہر قسم کی غلط فہمی کے پردہ کو چاک کر دیا اور حقیقت حال واضح کر دی۔ مگر مکہ معظمہ سے روانگی کے بعد راستہ کے اعراب، بادیہ نشین

قبائل، بے خبر اشخاص، خالی الذہن افراد امامؑ کو دیکھتے ہیں کہ ایک جمعیت کے ساتھ ایک بڑے قافلہ کی شان سے جا رہے ہیں، دریافت کرتے ہیں۔ "کہاں جا رہے ہیں" "معلوم ہوتا ہے" "عراق، وہاں سے طلبی ہوئی ہے"۔ لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ معظمہ سے ساتھ آنے والی جماعت مختصر تھی مگر راستہ میں طرح طرح کے لوگ شریک ہونے لگے اور وہ جمعیت جو اس کے قبل ایک قافلہ کی حیثیت رکھتی تھی اب ایک لشکر کی صورت میں آگئی، کوئی اور ہوتا تو اس فوج کو غنیمت سمجھتا اس لشکر کے اپنے ساتھ ہو جانے کو بہترین موقع خیال کرتا، وہ چاہتا کہ کسی طرح انھیں اپنے ساتھ گرویدہ رکھے اور اپنی گرفت سے نکلنے نہ دے۔ ابھی تک امام حسین علیہ السلام بھی خاموش تھے، مجمع بڑھتا جاتا تھا۔ ہر منزل پر کچھ نہ کچھ نئے لوگ آکر شریک ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ جب عراق کے حدود میں پہنچے اور منزل زرود پر قافلہ پہنچا۔ عبداللہ ابن سلیم اور منذر ابن مشمعل اسدی نے جو مکہ معظمہ سے آکر قافلہ سے ملحق ہوئے تھے ایک شخص کو کوفہ کی طرف سے آتے دیکھا۔ امامؑ کی بھی نظر اس پر پڑی اور ٹھہر کر یہ چاہا کہ کچھ حالات کوفہ کے اس سے دریافت کریں۔ لیکن اس نے یہ دیکھ کر راستہ بدل دیا اور دوسری طرف روانہ ہوا۔ امامؑ اس کے بعد آگے بڑھ گئے مگر عبداللہ اور منذر نے قافلہ سے الگ ہو کر اس شخص سے ملاقات کی اور اس سے کوفہ کے حالات دریافت کیے۔ اس نے بیان کیا کہ میں کوفہ سے اس وقت چلا ہوں جب مسلم بن عقیلؑ اور ہانی ابن عروہؒ قتل ہو چکے تھے۔ یہ دونوں آدمی حالت معلوم کر کے واپس آئے۔ شام کا وقت تھا۔ رات بھر انھوں نے یہ بات دل میں رکھی۔ صبح کو جب امامؑ اپنے مخصوص احباب کے مجمع میں تشریف فرما تھے تو دونوں آدمی حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ "ہمیں کچھ عرض کرنا ہے، ارشاد ہو تو ان لوگوں کے سامنے عرض کریں اور اگر حکم ہو تو علیحدہ"۔ حضرت نے ایک نظر ان اصحاب پر ڈالی جو اس وقت موجود تھے اور فرمایا۔ ما دون هولاء ستر۔ ان لوگوں سے راز کی بات کیا ہوگی؟ دونوں شخصوں نے عرض

کیا۔ آپ نے اس سوار کو ملاحظہ فرمایا تھا جو کل شام کو کوفہ کی طرف سے آ رہا تھا؟
حضرتؑ نے فرمایا "ہاں اور میں نے چاہا بھی تھا کہ اس سے کچھ حالات دریافت
کروں" انھوں نے عرض کیا ہم نے حضور کا منشا پورا کر دیا وہ ہمارے ہی قبیلہ کا ایک
شخص ہے۔ قابل اطمینان اور معتبر، اس نے یہ بیان کیا کہ مسلمؑ ابن عقیل اور ہانی ابن
عروہ شہید ہو گئے اور ان کی لاشیں بازار میں پھرائی گئیں۔ امام علیہ السلام نے یہ سن
کر بس چند مرتبہ انا للہ وانا الیہ راجعون رحمۃ اللہ علیہما کا کلمہ زبان
پر جاری فرمایا اور خاموش ہو گئے۔

یہ دونوں آدمی جو شب بھر اس وحشت ناک خبر کو اپنے دل میں رکھ کر اس
سے کافی اثر لے چکے تھے اور تمام صورتِ حال پر غور کر چکے تھے کہ کوفہ جانا اب
بیکار ہے اور کوئی امید کوفہ میں باقی نہیں ہے۔ انھوں نے بے تاب ہو کر کہا۔
ننشدك الله فی نفسك واهل بيتك الا انصرفت من مكانك
هذا فانه ليس لك بالكوفة ناصر ولا شيعة بل نتخوف ان
تكون عليك۔

"ہم حضور کو خدا کا واسطہ دے کر کہتے ہیں کہ بس یہیں سے واپس
چلیے کیونکہ کوفہ میں آپ کا نہ کوئی مددگار ہے اور نہ دوست بلکہ ہمیں
اندیشہ ہے کہ کوئی ناگوار صورت پیش نہ آئے"۔

حضرت نے مناسب وقت جواب دے کر ان لوگوں کی تسلّی کر دی اور پھر خاموشی
اختیار فرمالی۔

معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتاً جیسا امامؑ نے مجمع کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ "ان لوگوں سے
کوئی راز کی بات راز نہیں ہے۔" تو وہ جماعت تھی ہی ایسی راز دار وامانتدار کہ ایسی
عظیم خبر کی اطلاع ہوئی۔ اور اس مجمع میں بیان کی گئی مگر پھر بھی عام اہلِ قافلہ سے
وہ راز ہی کی صورت میں رہی اور کسی شخص کو اس کی اطلاع نہ ہوئی اور نہ کوئی انتشار
پیدا ہوا نہ اضطراب۔

عبداللہؓ بن یقطر جو حضرت کے رضاعی بھائی تھے اور آپ نے ان کو راستہ سے روانہ فرمایا تھا ان کی شہادت کی بھی خبر آگئی۔ اور حضرتؑ نے سن لی۔ عام قافلہ والے اب بھی یہی سمجھتے ہیں کہ کوفہ کی فضا امامؑ کے موافق ہے۔ لیکن امامؑ لوگوں کی غلط فہمی سے فائدہ اٹھانا کب منظور کر سکتے ہیں۔ آپ نے چاہا کہ حقیقتِ حال واضح ہو جائے چنانچہ جب آپ منزل پر پہنچے تو آپ نے قیام فرمایا۔ اور ایک تحریر جسے سرکاری بیان کہنا چاہیے، آپ نے تمام اہل قافلہ کے مجمع میں سب کو پڑھ کر سنائی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط امّا بعد، فقد اتانا خبر فظیع قتل مسلم بن عقیل وھانی بن عروۃ وعبداللہ بن یقطر وقد خذ لتنا شیعتنا فمن احبّ منکم الانصراف فلینصرف فلیس علیہ منا ذمام۔

"ہمارے پاس ایک دردناک خبر پہنچی ہے کہ مسلم بن عقیلؑ اور ہانی بن عروہؓ اور عبداللہؓ بن یقطر شہید کر ڈالے گئے اور وہ لوگ جو ہماری دوستی کا دعویٰ کرتے تھے انھوں نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس صورتِ حال کے بعد جو شخص تم میں سے واپس جانا چاہے وہ واپس چلا جائے۔ ہماری طرف سے اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہے۔"

یہ حضرت کی تقریر تھی جس کے بعد تفرق الناس عنہ تفرّقا فاخذوا یمینا وشمالا حتی بقی فی اصحابہ الذین جاء وامعہ من المدینۃ۔ "لوگ متفرق ہونے لگے اور کوئی داہنی طرف کوئی بائیں طرف اٹھ اٹھ کے جانے لگے، یہاں تک کہ بس وہی منتخب جماعت رہ گئی جو آپ کے ساتھ مدینہ منورہ سے آئی تھی۔" اس طرح سے مجمع چھٹ گیا اور صرف وہی لوگ رہ گئے جو آپ کی مکہ معظمہ والی تقریر سن چکے تھے۔ اور حقیقتاً موت پر آمادہ تھے۔

مورخ کا بیان "آپ نے یہ صورت اس لیے اختیار کی کہ آپ کو خیال تھا کہ عام عرب راستہ سے آپ کے ساتھ ہو گئے ہیں اس گمان پر کہ آپ ایسے شہر جا رہے ہیں جہاں کے لوگ پورے طور سے آپ کے فرماں بردار اور مطیع ہیں، جہاں کی زمین پورے طور سے ہموار ہو چکی ہے۔ آپ کو یہ گوارا نہ ہوا کہ وہ لوگ غلط فہمی میں مبتلا رہیں آپ نے چاہا کہ صرف وہی لوگ آپ کے ساتھ رہ جائیں جو حقیقتِ حال سے مطلع ہوں اور سمجھ چکے ہوں کہ صورت حال کیا ہے۔ آپ کو یقین تھا کہ آپ کے اعلان کے بعد بس وہی لوگ رہ جائیں گے جو آپ کے سچے ہمدرد اور آپ کے ساتھ جان دینے پر تیار ہیں"۔

(طبری ج ۶ ص ۲۲۶)

راستہ کی منزلیں ختم ہوئیں اور اب وہ وقت ہے کہ حضرتؑ کربلا پہنچ چکے۔ صلح کی گفتگو ختم ہو چکی اور دشمن نے حملہ بھی کر دیا۔ صرف ایک رات کی مہلت ملی ہے اور وہ بھی بمشکل عبادتِ خدا کے لیے، مگر امام حسینؑ اب بھی اتمامِ حجت کرتے ہیں۔ ساتھیوں کو ایک آخری موقع دیتے ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ اب جو لوگ تھے وہ منتخب، وہ حقیقتاً موت پر تیار مگر حضرتؑ نے چاہا کہ ان کا بھی امتحان ہو جائے اور ان کے ثباتِ قدم کا بہترین مظاہرہ سامنے آجائے۔

چنانچہ امام زین العابدینؑ کی روایت ہے کہ جب عمر بن سعد سے ایک شب کی مہلت مل گئی اور عمر سعد کی فوج واپس گئی تو حضرتؑ نے اپنے اصحابؓ کو جمع فرمایا امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں کہ میں بیمار تھا، مگر ذرا قریب پہنچا کہ سنوں حضرتؑ کیا فرماتے ہیں حضرتؑ نے فرمایا۔ اثنی علی اللہ تبارک و تعالٰی احسن الثناء واحمدہ علی السراء و الضراء" میں خدا کی بہترین ثنا کا فرض ادا کرتا اور سختی ہو یا آسانی ہر حال میں اس کا شکر کرتا ہوں۔

اللھم انی احمدك علی ان اکرمتنا بالنبوۃ وعلمتنا القرآن ونقھتنا فی الدین وجعلت لنا اسماعا وابصارا وافئدۃ ولم تجعلنا من المشرکین

"خداوندا میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں کہ تو نے نبوت عطا کر کے ہماری عزت بڑھائی اور قرآن کی تعلیم ہم کو عطا کی اور دین میں ہم کو فقیہہ قرار دیا۔ ہم کو تو نے گوشِ شنوا اور چشم بینا اور قلبِ دانا عطا فرمائے اور ہم کو تو نے جماعتِ مشرکین سے نہیں قرار دیا۔"

اما بعد فانی لا اعلم اصحابا اوفی ولا خیرا من اصحابی ولا اھل بیت ابر ولا اوصل من اھل بیتی فجزاکم اللہ عنی جمیعا خیرا۔" (اب حضرتؑ اصحابؓ کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور فرماتے ہیں) "مجھے علم نہیں ہے کہ دنیا میں کسی کے اصحاب میرے اصحاب سے زیادہ وفادار اور ان سے بہتر ہوں (اصحابؓ کا ذکر پہلے کر دیا اس لیے کہ غیروں کا معاملہ تھا مگر خیال ہوا کہ عزیزوں کی دل شکنی نہ ہو اس لیے اصحاب کے بعد عزیزوں کا تذکرہ ضروری معلوم ہوا) اور نہ مجھے کسی کے اعزا (خاندان والے) معلوم ہیں جو میرے عزیزوں سے زیادہ حق شناس اور مطیع و فرمانبردار ہوں۔ خدا تم سب کو میری طرف سے نیک بدلہ دے اور جزائے خیر عطا فرمائے۔"

الا وانی اظن یومنا من ھٰولاءِ الاعداء غدا الا وانی قد رأیت لکم فانطلقوا جمیعا فی حل لیس علیکم منی ذمام ھٰذا لیل قد غشیکم فاتخذوہ جملا۔

"آگاہ ہو کہ میرے خیال میں کل کا دن ہمارا ان اعداء کے ساتھ تاریخی دن ہوگا۔ میں نے تمہارے متعلق غور کیا ہے اور میری رائے تمہارے

لیے یہ ہے کہ تم سب اس وقت چلے جاؤ اور میری اجازت ہے کہ میرا ساتھ چھوڑ دو، کوئی تمہارے اوپر میری طرف سے ذمہ داری عائد نہ ہو گی۔ دیکھو یہ رات کا پردہ پڑ گیا ہے، اسے تم اپنے لیے غنیمت سمجھو۔ اور اس سے فائدہ اٹھاؤ۔"

عزیزوں سے خود نہیں کہا کہ تم چلے جاؤ۔ مگر اس لیے کہ اصحاب کو بُرا نہ معلوم ہو۔ اصحاب سے یہ فرمایا کہ لیاخذ کل رجل منکم بید رجل من اھل بیتی ثم تفرقوا فی سوادکم و مدائنکم حتی یفرج اللہ فان القوم انما یطلبونی ولو قد اصابونی لھوا عن طلب غیری۔

"تم خود جاؤ اور اتنا اور بھی کرو کہ ہر ایک تم میں سے ایک ایک میرے عزیز کا ہاتھ پکڑ لے اور اسے ساتھ لیتا جائے۔ اس کے بعد اپنے اپنے دیہات اور شہروں میں متفرق ہو جاؤ۔ تاوقتیکہ تمھیں کشائش اور بنی امیہ کی سلطنت سے نجات حاصل ہو اور اس لیے کہ یہ لوگ صرف میرے طالب ہیں اگر میں انہیں مل جاؤں اور مجھ کو قتل کر ڈالیں تو پھر انھیں کسی دوسرے کی فکر نہ ہو گی۔"

بس یہ اتمامِ حجت تھی۔ لیکن ایسی جماعت کے سامنے جس کا کوئی فرد حقیقتِ حال سے بے خبر ہو کر ساتھ نہیں آیا تھا کوئی لالچ اور طمعِ دنیوی پیش نظر رکھ کر شریک نہیں ہوا تھا۔ اس لیے ایک طرف اعزّا کھڑے ہو گئے، بھائی، بیٹے، بھتیجے اور عبداللہ بن جعفرؑ کی اولاد اور سب نے کہا۔ جن میں سب سے پہلے بولنے والے حضرت عباسؑ بن علیؑ تھے کہ لم نفعل لنبقی بعدک لا ارانا اللہ ذلک ابدا۔ "یہ کیوں؟ کس لیے؟ کس واسطے ہم واپس چلے جائیں؟ اس لیے کہ آپ کے بعد زندہ رہیں؟ خدا ہم کو یہ روزِ بد نصیب نہ کرے۔"

حضرت متوجہ ہوئے اولادِ عقیلؑ کی طرف اور فرمایا۔

تمھارے لیے مسلمؑ کا قتل ہونا کیا کم ہے ؟ تم تو چلے جاؤ، تم کو میں نے اجازت دے دی "

انھوں نے کہا "ایسا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ہم بھی اپنی جانیں آپ کے قدموں پر نثار کریں گے "

اصحابؓ بظاہر اعزاؑ کے احترام کی وجہ سے خاموش تھے جب اعزاؑ اپنے خیالات کا اظہار کر چکے تو وہی اسی برس کا ضعیف العمر جان نثار مسلم بن عوسجہؓ مجمع کے درمیان سے کھڑا ہوا۔ انصارِ حسینؑ میں ان سے زیادہ مسن کوئی نہ تھا۔ پشت خمیدہ اور جسم کمزور تھا مگر دیکھنے کی بات ہے کہ کہیں الفاظ سے دل کی کمزوری نمایاں نہیں ہے۔ عرض کرتے ہیں ۔

انحن نخلی عنک ولما نعذر الی اللہ فی اداء حقک

اما واللہ اطعنھم حتیٰ اکسر فی صدورھم رمحی

واضربھم بسیفی ما ثبت قائمہ فی یدی ولا افارقک

ولو لم یکن معی سلاح اقاتلھم بہ لقذفتھم بالحجارۃ

دونک حتیٰ اموت معک ۔

"ہم آپ کو چھوڑ دیں ؟ اس صورت میں خدا کو کیا جواب دیں گے ؟ خدا کی قسم میں ان دشمنوں کو اتنے نیزے لگاؤں گا کہ ان کے سینوں میں میرا نیزہ ٹوٹ جائے اور اس وقت تک شمشیر زنی کروں گا جب تک اس کا قبضہ میرے ہاتھ میں رہے، میں آپ سے کسی وقت جدا نہ ہوں گا۔ اور اگر ہتھیار میرے پاس نہ ہوں گے اور بیکار ہو جائیں گے، تب بھی پتھروں سے ان سے جنگ کروں گا۔ یہاں تک کہ آپ کی نصرت میں کام آؤں اور آپ کے قدموں پر اپنی جان نثار کروں "

مسلم بن عوسجہؓ نے جو کہنا تھا وہ کہہ کر بیٹھ گئے۔ تب ان سے کم عمر کے جو لوگ تھے ان کو جرأت ہوئی کچھ کہنے کی ۔ یہ ادب تھا، یہ اخلاقی تربیت تھی ۔ یہ شائستگی تھی۔

جس طرح بنی ہاشم سے پہلے اصحاب نے کچھ نہیں کیا، اسی طرح اصحاب میں کسی نوعمر آدمی کو اس وقت تک جرأت نہیں ہوئی۔ جب تک مسلمؑ اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر چکے۔

اب سعید بن عبداللہ حنفی کھڑے ہوئے، انھوں نے کہا۔

"واللہ لانخلیک حتیٰ یعلم اللہ انا قد حفظنا غیبۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فیک واللہ لو علمت انی اقتل ثم احیا ثم احرق حیا ثم اذر یفعل ذلک بی سبعین مرۃ مافارقتک حتیٰ القیٰ حمامی دونک فکیف لا افعل ذلک وانما ھی قتلۃ واحدۃ ثم ھی الکرامۃ التی لا انقضاء لھا ابدا۔

"خدا کی قسم ہم آپ کا ساتھ نہ چھوڑیں گے جب تک ثابت نہ کر دیں کہ ہم نے جناب رسولِ خداؐ کی وصیت کو جو آپ کے بارے میں تھی پورا کر دیا۔ خدا کی قسم اگر مجھے معلوم ہو کہ میں قتل ہوں گا، پھر زندہ کیا جاؤں گا، پھر جیتے جی آگ میں جلایا جاؤں گا، پھر میری خاک ہوا میں منتشر کی جائے گی، ایسا ہی میرے ساتھ ستّر مرتبہ سلوک ہو گا تب بھی آپ سے جدا نہ ہوں گا جب تک کہ آخری موت آپ ہی کے قدموں پر نہ آئے، چہ جائیکہ اب میں آپ کا ساتھ چھوڑ دوں گا؟ حالانکہ جانتا ہوں کہ ایک ہی مرتبہ قتل ہونا ہے اور اس کے بعد زندگی ہی زندگی اور عزتِ دائمی ہے۔"

اس کے بعد زہیرؓ بن القین کھڑے ہوئے۔ یہ وہی پُرجوش جان نثار ہیں جنھوں نے حرؓ کے معاملہ میں کہا تھا کہ ہمیں ان سے لڑ لینے دیجئے۔ یہ کھڑے ہوئے اور کہا (معلوم ہوتا ہے دلوں میں وہ تلاطم ہے کہ الفاظ تلاش کرتے ہیں مگر مطلب ادا کرنے کو ملتے نہیں)۔

"خدا کی قسم میری تو یہ آرزو ہے کہ میں قتل کیا جاؤں اور پھر زندہ ہوں اور پھر قتل کیا جاؤں، یونہی ہزار مرتبہ میرے ساتھ سلوک ہو، لیکن کسی طرح آپ کی اور آپ کے اعزّا و اقارب ان ہاشمی جوانوں کی جان بچ جائے جو آپ کے ساتھ ہیں۔"

دیگر اصحاب نے بھی ملتے جلتے الفاظ میں اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا۔ اور سب نے متفق اللہجہ یہ کہا کہ :

"ہم آپ سے جدا نہیں ہوں گے۔ بلکہ اپنی جان آپ پر فدا کریں گے۔ اپنے سینے سر، بازو، تمام اعضاء و جوارح آپ کی نصرت میں صرف کر دیں گے۔ جب ہم مرجائیں گے اور دنیا سے رخصت ہو جائیں گے تو اس وقت سمجھیں گے کہ ہم نے وفا کی اور جو ہمارا فرض تھا اس کو ادا کر دیا[1]۔"

امام حسینؑ نے اس طرزِ عمل سے یہ سبق دیا کہ دنیا میں حقانیت، ضمیر کی صفائی اور امانت کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ کسی غلط فہمی سے فائدہ اٹھا کر اپنا مقصد نہ نکالے۔ کبھی غلط توقعات قائم کر کے اپنی کار برآری نہ کرے۔ غلط فہمی کا سدِّباب کر کے جو حقیقی جان نثار ہیں بس ان کی ہمدردی کو قبول کرے اور کسی کی غلط اندیشی و فریب پذیری سے فائدہ نہ اٹھائے۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۸-۲۳۹

چند مختلف سبق

واقعۂ کربلا اور اس کے عملی نتائج ایک طویل الذیل موضوع ہے۔ واقعۂ کربلا کا ہر جزئی واقعہ سرچشمہ ہے اخلاقی تعلیمات کا، اجتماعی تعلیمات کا۔ مذہبی تعلیمات کا۔

امام حسینؑ نے تمام کمالاتِ انسانی کا مرقع پیش کر دیا تھا، اور حقیقت میں واقعۂ کربلا ایک وہ واقعہ ہے جس میں حق و باطل کے تمام خصوصیات بے نقاب ہو کر سامنے آ گئے تھے۔

یعنی اس عظیم فیصلہ کن تاریخی واقعہ کے پہلے حق و باطل کی صورتیں مشتبہ تھیں۔ خصوصیات نمایاں نہ تھے لیکن واقعۂ کربلا کا یہ نتیجہ تھا کہ ایک طرف حق کے اندر جتنے دلفریب۔ خوش آئند، مستحسن خط وخال ہیں وہ دنیا کی آنکھوں کے سامنے آ گئے اور دوسری طرف باطل میں جتنی برائیاں، خرابیاں، بہیمیت، وحشیت کی صفتیں ہیں وہ سب عالم کے پیش نظر ہو گئیں۔

حسینؑ نے کربلا میں جتنے گرانقدر سبق دیے ہیں۔ وہ ایسے نہیں ہیں کہ انھیں نگاہ غلط انداز سے دیکھ کر نذرِ تغافل کر دیا جائے بلکہ وہ ایسے ہیں کہ انھیں لائحہ زندگی اور دستور العملِ حیاتِ ملّی قرار دیا جائے۔

انھوں نے صلح اور رواداری کی تعلیم دی۔ امن پسندی کا سبق دیا۔ حمایتِ حق کا اصول بتایا۔ استقلال اور ثباتِ قدم کا نمونہ دکھلایا۔ یہ تمام وہ باتیں جن کا تذکرہ سابق میں ہو چکا ہے۔ اس سب کے علاوہ آپ نے یہ بھی تعلیم دی کہ کس طرح ایک انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ احسان کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔ اس کے وقت پر کام آنا چاہیے۔ اگرچہ وہ اپنا دوست نہ ہو دشمن ہو، دوستوں کے ساتھ مراعات واحسان کرنا ایک معتدل الفطرت انسان کا خاصۂ مزاج ہے۔ اور کوئی غیر معمولی امر

نہیں ہے لیکن دشمنوں کے ساتھ احسان کرنا، ان لوگوں کے ساتھ سلوک نیک کرنا جو اپنے سے جنگ پر تیار ہوں، ان کی ضرورت پر کام آنا جو اپنے خون کے پیاسے ہوں، یہ ہر انسان کا کام نہیں ہے۔ یہ سبق حسینؑ نے دیا۔ اس وقت جب منزلِ شراف سے آگے بڑھے ہیں حکم دیا کہ پانی مشکوں میں بھر لو اور جتنا ممکن ہو زیادہ پانی اپنے ساتھ لے لو۔ اصحابؓ نے تعمیل حکم کی اور پانی کثرت سے اپنے ساتھ لے لیا۔ یہاں تک کہ حضرتؑ اس منزل سے آگے بڑھے۔ راستہ برابر قطع ہو رہا تھا کہ سامنے سے فوج آتی ہوئی نظر آئی۔ حضرت نے راستہ اپنا بدل کر ذوحسم پہاڑی کے پاس جا کر قیام کیا۔

آتی ہوئی فوج بھی اسی طرف متوجہ ہوئی اور تھوڑی دیر میں امامؑ کی فوج کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ یہ حُرؓ کا ایک ہزار آدمیوں کا رسالہ تھا اور حضرتؑ کے سدِ راہ ہونے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ لیکن حالت اس وقت یہ تھی کہ پیاس کا غلبہ ہو گیا تھا چہرے اداس تھے اور راکب و مرکب شدتِ عطش سے جاں بلب تھے۔ بس اب حسینؑ کے لیے دوست و دشمن کا سوال کوئی چیز نہ تھا۔ حسینؑ کے دل پر اس حالت کو دیکھ کر چوٹ پڑ رہی تھی۔ اور اس سے مطلب نہ تھا کہ فریقِ مقابل آپ سے جنگ کے لیے آیا ہے۔ آپ کو یہ بھی پروا نہیں ہوئی کہ ہم کو خود اس کے بعد کس طرح کے جنگلوں میں چلنا ہو گا اور پانی دستیاب ہو گا یا نہیں۔

حضرتؑ نے حکم دیا کہ اسقوا القوم وارادھم من الماء ورشفوا الخیل ترشیفا۔

”ان لوگوں کو پانی پلاؤ اور سیراب کر دو اور ان کے گھوڑوں کو بھی پانی پلا کر سیراب کر دو۔“

حسینی فوج کے نوجوان کھڑے ہو گئے اور پانی پلانے میں مصروف ہو گئے تمام فوج کو معہ راکب و مرکب کے سیراب کر دیا۔ حالت یہ تھی کہ طشتوں میں، کاسوں میں، پیالوں میں پانی بھر بھر کر گھوڑوں کے پاس لے جاتے تھے اور جب ایک ایک گھوڑا پانی سے سیراب ہو کر تین، چار، پانچ مرتبہ منہ الگ کر لیتا تھا تب دوسرے

گھوڑے کے پاس لے جاتے تھے یہاں تک کہ جتنے گھوڑے تھے سب کو سیراب کر دیا۔

علی بن طعان محاربی کا بیان ہے کہ میں حرؒ کی فوج میں سب سے آخر میں رہ گیا تھا۔ مجھ پر پیاس کا انتہائی غلبہ تھا۔ حضرتؑ نے جو میری اور میرے گھوڑے کی پیاس دیکھی تو فرمایا۔ "انخ الراویة" راویہ کو بٹھا لے" (راویہ شتر آب کش کو کہتے ہیں) یہ شخص عراق کا رہنے والا تھا، وہ راویہ کے معنی مشک کے سمجھتا تھا، اس لیے کچھ معنی اس کی سمجھ میں نہ آئے حضرتؑ نے فرمایا۔ یا ابن اخی انخ الجمل۔ یہ مہربانی ہے، یہ ملائمت ہے، مخاطب بظاہر نوعمر آدمی تھا، اسے بیٹا، بھیتجا فرما کر خطاب کر رہے ہیں "میرے بھائی کے فرزند جمل (اونٹ) کو بٹھا دو۔" اس نے اونٹ کو بٹھا دیا حضرتؑ نے فرمایا "پیو، پانی پیو۔" راوی کا بیان ہے کہ میں اتنا بدحواس تھا پیاس کی وجہ سے کہ جب پانی پینا چاہتا تھا پانی بہنے لگتا تھا۔ کسی طرح میرے منہ میں نہ جاتا تھا، حضرتؑ نے فرمایا "مشک کو اپنی طرف موڑ لے۔" میری کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ کس طرح سے پانی پیوں۔ تب حضرتؑ خود اپنی جگہ سے اٹھے اور قریب تشریف لاکر اپنے ہاتھ سے مشک کے دہانہ کو درست فرمایا۔ اور جب میں اور میرا گھوڑا سیراب ہو لیے تب حضرتؑ تشریف لے گئے۔

یہ بھی اخلاقی تعلیم۔ یہ بھی حسینی تعلیم۔ اس طرح بتایا کہ کس طرح دشمنوں کے ساتھ انسان کو حسنِ سلوک کرنا چاہیئے۔ کس طرح دشمن کی بھی امداد کرنا چاہیئے۔ جہاں تک اس کی امداد سے حمایتِ باطل نہ ہو۔

شخصی و انفرادی حیثیت سے کافر بھی ہو تو اس کی مدد کرنا چاہیے مگر اس کے کفر میں امداد نہ کرے۔ اور حمایتِ باطل کے جرم کا مرتکب نہ ہو۔

یہ تو دشمنوں کے ساتھ حضرتؑ کے حسنِ سلوک کا نمونہ تھا۔ دشمنوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیئے اور اپنوں میں کس طرح انسان کو مساوات مدِنظر رکھنا چاہیے اس کا بھی بہترین سبق امام حسینؑ نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ قبل کے واقعات کا تذکرہ

اہم نہیں ہے اس لیے کہ سفر سہی، مگر اطمینان کا وقت تھا، امن و سکون کا دور تھا۔ کوئی ایسی سخت صورتِ حال نہ تھی۔ مگر عاشور کے دن جب مصائب کا ہجوم تھا اس وقت حسینؑ نے کس طرح سے حقوق کا لحاظ کیا ہے۔ کس طرح یہ خیال رکھا ہے کہ جانبداری اور کسی خاص پاسداری کا پہلو پیدا نہ ہونے پائے، عزیز بھی تھے اور غیر بھی تھے، مگر آپ کا طرزِ عمل سب کے ساتھ مساوی تھا، کسی طرح کی خصوصیت جو عزیزوں کے ساتھ ہو وہ غیروں کے ساتھ نہ برتی گئی ہو، ناممکن ہے۔ جو شہید گھوڑے سے گرا حضرتؑ خود تشریف لے گئے، کوئی تخصیص نہیں۔ آزاد بھی تھے۔ اور غلام بھی تھے، قریش بھی تھے اور غیر قریش بھی۔ ہاشمی بھی تھے اور غیر ہاشمی بھی، اپنے دل کے ٹکڑے بھی تھے اور اغیار بھی۔ مگر سب کے ساتھ یکساں برتاؤ، متحد طرزِ عمل، کہیں تفریق نہیں چاہے اس میں خود حضرتؑ کے نفس کو کتنی تکلیف برداشت کرنا پڑی ہو۔

جنگ کے میدان میں اور خیام کی جگہ میں کافی فاصلہ تھا۔ جو شہید جنگ کے لیے جاتا تھا وہ میدان میں لڑتا اور وہیں شہید ہو کر گرتا تھا۔ اب ملاحظہ فرمایئے امامؑ کا تعب، امامؑ کی تکلیف، حضرتؑ کی ہر شہید کی لاش پر جانا، اور پھر اس کی لاش لے کر واپس آنا۔ اس طرح اکہتر دفعہ اس طویل مسافت کو طے کرنا، جانا اور پھر واپس آنا، اُس دھوپ میں اس گرمی میں، اس تمازتِ آفتاب میں اتنی تکلیف، اتنی زحمت، اتنی مشقت برداشت کی مگر یہ نہیں ہوا کہ کسی شہیدِ راہِ خدا کے حق میں کوتاہی ہو جاتی۔

نہیں، سب کے ساتھ عزیزوں کا سا برتاؤ۔ جو آتا تھا اجازت مانگتا تھا بغور اسے دیکھتے تھے اجازت دیتے تھے، جب تک وہ جنگ کرتا تھا کھڑے ہو کر اس کی جنگ کا مشاہدہ فرماتے تھے۔ جب گرتا تھا تو فوراً لاش پر پہنچتے تھے۔

اس طرح یہ بتایا کہ کس طرح ایک سردار، ایک رئیس، ایک افسر کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ مساوات، اور یگانگی کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ ایک سرگروہ کا فرض کیا ہے۔ اسے اپنے ساتھ جان صرف کرنے والوں کے ساتھ کیا برتاؤ اختیار کرنا چاہیے؟

مجھے معلوم ہے اصحابؓ اتنے باوفا تھے کہ اگر یہ طرزِ عمل نہ بھی ہوتا تب بھی ان کے ارادوں میں تزلزل نہ ہوتا۔ کیونکہ وہ اس برتاؤ کے غلام بن کر جان نہیں دے رہے تھے بلکہ وہ ایک اصول کے تحت میں اپنی جان قربان کر رہے تھے۔ لیکن یہ آپ کی فرض شناسی تھی، یہ آپ کی اخلاقی تعلیم تھی۔

اس وقت تک حقوق الناس کا تذکرہ تھا۔ اب حقوق اللہ کی مراعات ملاحظہ ہو۔ خدا کے ساتھ ایک بندہ کا جو واسطہ ہوتا ہے اس کا کس حد تک امامؑ نے خیال کیا۔ اور کس طرح امامؑ کے ساتھیوں نے اس کا خیال رکھا۔

ایک شب کی مہلت مانگی اور وہ بمشکل ملی۔ ایک دنیا سے جانے کے لیے تیار انسان، اس کے دل میں کیا کیا تمنائیں ہوتی ہیں۔ امامؑ نے ایک شب کی مہلت لی۔ کیا اعزا سے ملنے کے لیے، کیا اس لیے کہ ایک شب اہل حرم کو جی بھر کر دیکھ لیں، اپنے بعد کے متعلق ہدایتیں کر دیں؟ نہیں یہ کچھ نہیں بلکہ صرف خدا کی عبادت کے لیے۔

چنانچہ ایسا ہی کیا۔ ضحاک بن عبداللہ مشرقی ناقل ہیں۔ فلما امسیٰ حسین واصحابہ قاموا اللیل کلہ یصلون ویستغفرون ویدعون ویتضرعون

"جب شام ہوئی تو امامؑ اور آپ کے اصحابؓ نے تمام رات گزاری کھڑے کھڑے نماز کی حالت میں دعا اور استغفار اور تضرع کی حالت میں۔"[1]

ابھی پھر بھی آسان تھا۔ مگر وہ وقت کہ جب عاشور کے قیامت خیز دن کہ ظہر کا وقت آچکا ہے، موت کا بازار گرم ہے۔ اصحاب میں بہت آدمی شہید ہو چکے ہیں مسلم بنؓ عوسجہ، عبداللہؓ بن عمر، بریر بن خضیرؓ، عمروؓ بن قرظہ، نافعؓ بن ہلال وغیرہ امامؑ کا ساتھ چھوڑ کے راہئ جنت ہو گئے ہیں۔ نماز ظہر کا وقت آیا۔ ابو ثمامہؓ، عمرو بن عبداللہؓ صائدی حاضرِ خدمتِ امامؑ ہوئے اور عرض کی۔

یا ابا عبد اللہ نفسی لک الفداء انی اریٰ ھٰؤلاء قد اقتربوا منک ولا واللہ لا تقتل حتیٰ اقتل دونک ان شاء اللہ

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۲۴۰۔

واجب ان القیٰ ربی وقد صلیت ھٰذہ الصلوٰۃ التی قد دنا وقتھا۔

"یا اباعبداللہؑ! میری جان آپ پر نثار، میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ لوگ آپ کے بہت قریب آ گئے ہیں لیکن خدا کی قسم آپ پر کوئی آنچ نہیں آسکتی جب تک میں آپ کے سامنے قتل نہ ہو جاؤں، میرا دل چاہتا ہے کہ خدا کے یہاں جو جاؤں تو یہ نماز آپ کی معیت میں پڑھ کر جس کا وقت قریب آگیا ہے۔"

امام حسینؑ نے اپنا سر اٹھایا۔ فرمایا:

ذکرت الصلوٰۃ جعلك اللہ من المصلین الذاکرین نعم ھذا اوّل وقتھا

"تم نے اس وقت میں بھی نماز کو یاد رکھا خدا تم کو نماز گذاروں اور نماز کے یاد رکھنے والوں میں محسوب فرمائے۔ ہاں یہ تو اول وقت ہے نماز کا۔"

پھر فرمایا۔ "ان سے کہو اتنی مہلت دے دیں کہ ہم نماز پڑھ لیں۔"

واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مہلت نہیں ملی اور دشمن کی فوج نے جنگ سے ہاتھ نہیں روکا۔ حصین بن تمیم نے مہلت نماز کی خواہش پر یہ جواب دیا انھا لاتقبل۔ جس پر حبیبؓ بن مظاہر کو غصہ آگیا "نماز قبول نہ ہو گی؟ ارے تیری نماز قبول ہو اور اولادِ رسولؐ کی نماز قبول نہ ہو؟" حصین بن تمیم نے حملہ کر دیا اور حبیبؓ بن مظاہر نے اس سے مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ اس کو زخمی کر دیا۔ اور لوگ اس کو حبیبؓ کے ہاتھ سے چھڑا کر لشکر میں لے گئے۔ حبیبؓ نے جوش میں رجز پڑھا۔

اقسم لو کنا لکم اعدادا — او شطرکم ولیتم اکتادا

یا شرّ قوم حسبا و آدا

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر ہماری تعداد تمھاری اتنی ہوتی یا تمھاری تعداد کی نصف بھی ہوتی تو تم میں کا ایک شخص بھی میدان جنگ میں نہ رہتا اور میدانِ جنگ صاف نظر آتا۔"

اس رجز کے بعد شاید یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں ہماری قلت تعداد کو ہماری کمزوری کی دلیل نہ سمجھا جائے اس لیے دوسرا رجز پڑھنے لگے۔

انا حبیب وابی مظاھر فارس ھیجاء وحرب تسعر
انتم اعدّ عدۃ و اکثر ونحن اوفی منکم واصبر
ونحن اعلیٰ حجۃ واظہر حقّا واتقیٰ منکم واعذر

"میں حبیبؓ ہوں اور میرے باپ کا نام مظاہر ہے شہسوار ہوں میدانِ جنگ کا، ایسی جنگ کا جس کے شعلے بھڑک رہے ہوں۔ تم بے شک تعداد میں زیادہ ہو اور بہت ہو مگر یاد رکھنا کہ ہم وفا میں تم سے زیادہ اور صبر و استقامت میں تم سے بڑھے ہوئے ہیں۔ نیز (تمھاری تعداد زیادہ ہو تو ہو) ہم حق پر ہیں ہماری حجت تم سے زیادہ قوی اور روشن اور ہمارا تقویٰ مستند اور ہماری حجت تمام ہے۔"

اس سے حبیبؓ نے اکثریت کے عام معیارِ حقیقت کو باطل کیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کثرت دلیلِ حقانیت نہیں ہے نصرت ہمارے ہی ساتھ ہے۔ ہماری شکست بھی فتح اور ہمارا انجام دائمی زندگی ہے۔ آپ نے بہت سخت جنگ کی یہاں تک کہ شہید ہوئے۔

میری جہاں تک سمجھ میں آتا ہے دشمن نے جنگ کو ملتوی نہیں کیا۔ مگر کیا کہنا اصحابِ حسینؑ کی فرض شناسی اور عبادتِ الٰہی کے ذوق و شوق کا۔ وہ بھی ایک اتمامِ حجت تھی جو جنگ روکنے کی خواہش کی تھی۔ مگر جب جنگ نہیں رُکی تو ثابت کر دیا کہ ہم جنگ روکنے کے محتاج نہیں ہیں۔ امیر المومنینؑ نے بھی اس کا عملی سبق دیا تھا۔ جنگِ صفین میں آپ کا مصلیٰ دونوں صفوں کے درمیان بچھا دیا گیا تھا۔

ابن عباسؓ نے کہا تھا کہ یہ وقت نماز کا ہے ؟ تو حضرت نے فرمایا تھا کہ "اسی نماز کے لیے تو ہم جنگ کر رہے ہیں ۔"

"ائمہ معصومینؑ نے اس طرح ثابت کیا تھا کہ اگر حقیقی محبت کوئی ہمارے ساتھ رکھتا ہے تو اس کو ان فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرنا چاہیئے ۔"

امام حسینؑ نے ایسے سخت ترین موقع پر جب دنیا کا کوئی شخص مطمئن نہیں رہ سکتا تھا ۔ جب کہ کسی شخص کو فرائض کا احساس باقی نہیں رہ سکتا تھا ۔ ان فرائض کو ادا کر کے یہ سبق دے دیا کہ چاہے کیسا ہی سخت موقع پڑے لیکن فرض شناسی سے غافل نہ ہونا چاہیئے ۔ صلوٰۃ خوف کی صورت سے نماز ادا کی ۔ دو جان نثاروں کو سامنے کھڑا کیا ۔ ایک سعید بن عبداللہ حنفیؓ اور دوسرے زہیر بن القینؓ ۔ جو تیر آتا تھا یہ دونوں بزرگوار اپنے اوپر روکتے تھے ۔ معلوم ہوتا ہے میدانِ جنگ قبلہ رخ تھا ۔ اگر قبلہ سے علیحدہ ہوتا تو امام مصلے پر ہوتے ۔ اور جماعت پیچھے ۔ امامؑ کے سامنے کھڑے ہونے والے دو آدمی آپ کا بچاؤ کر لیتے ۔ لیکن پوری جماعت دشمنوں کے تیروں کے مقابل ہوتی ۔ امامؑ کو یہ گوارا نہیں ہو سکتا تھا کہ دوسرے لوگ تیروں کا نشانہ ہوں اور آپ بچ جائیں ۔ لیکن جب میدانِ جنگ قبلہ کے رخ پر ہو تو آگے سب کے امامؑ اور پیچھے مجاہدین کی صفِ نماز ۔ دو آدمی بھی جو امامؑ کے سامنے کھڑے ہو گئے تو صرف امامؑ کا نہیں تمام جماعت کا بچاؤ ہو گیا اور اس طرح نماز ادا کی گئی ۔ ادھر نماز ختم ہوئی ایک آدمی ان دو جان نثاروں میں سے یعنی سعید بن عبداللہ تیروں سے مجروح ہو کر زمین پر گر پڑا اور دنیا سے رخصت ہوا کیا کہنا اس نماز کا اور کیا کہنا ان مجاہدین کے ادائے فرض و ادائے حقِ وفا کا ۔ اب اصحابؓ نے شوقِ شہادت میں جانیں دینا شروع کیں امام حسینؑ اسی طرح اپنے فرائض اور سب کے حقوق ادا کر رہے ہیں ۔ یہاں تک کہ کوئی باقی نہیں رہا ۔ سب شہید ہو گئے ۔ اعزّا کی باری آئی ۔

تاریخ نے سب واقعات کو بیان ہی کہاں کیا ہے ۔ اس لیے کہ دوست باقی بچے نہیں تھے ۔ دشمنوں کو غرض کیا تھی کہ تمام واقعات بیان کرتے ۔ یقیناً اگر موقع ہوتا

توحضرت اعزاؑ کو اصحابؓ سے پہلے میدانِ جنگ جانے کی اجازت دیتے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اصحابؓ نے کسی طرح اس کو منظور نہیں کیا کہ ان کی زندگی میں کوئی شخص اولادِ ہاشم سے میدانِ جنگ میں جائے۔ مگر جب اصحابؓ شہید ہو چکے اور دل کے ٹکڑوں کی نوبت آئی تو اب بھائی کی اولاد تھی۔ یعنی امام حسنؑ کے صاحبزادے، چچازاد بھائی کی اولاد یعنی مسلمؑ کے فرزند، چچا کے بیٹے یعنی عقیلؑ کی اولاد۔ پھر ایک چچازاد بھائی کے بیٹے یعنی عبداللہ بن جعفرؑ کے صاحبزادے جو بھانجے کہے جاتے ہیں اپنے باپ کی اولاد یعنی بھائی اور خود اپنی اولاد۔ امام حسینؑ نے چاہا کہ کوئی اور میدانِ جنگ میں نہ جانے پائے اور یہ کہنے کو نہ ہو کہ بھائی کی اولاد تھی۔ لہٰذا اس لیے اسے پہلے بھیج دیا یا چچا کی اولاد کو پہلے بھیج دیا۔ اس لیے تاریخ کی مسلمہ حقیقت یہ ہے۔ حدیث اور تاریخ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ اعزا میں سب سے پہلے جناب علی اکبرؑ کو میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت ملی ہے۔ حدیث کلامِ معصومؑ کا نام ہے۔ کلامِ معصومؑ یعنی زیارت میں جو جناب علی اکبرؑ کے لیے وارد ہے صاف طور سے پہلا فقرہ یہ ہے کہ السلام علیک یا اوّل قتیل من نسل خیر سلیل من سلالۃ ابراھیم الخلیل۔

"سلام ہو آپ پر اے سب سے پہلے شہید ہونے والے نسل سے بہترین شخص کی اولاد ابراہیمؑ خلیلِ خدا میں سے۔"

تاریخ کی حیثیت سے طبری کی تاریخ میرے ہاتھ میں ہے۔ اس میں لکھا ہے:

کان اوّل قتیل من بنی ابی طالب یومئذ علی الاکبر بن الحسین بن علی وامہ لیلیٰ ابنۃ ابی مرۃ بن عروۃ بن مسعود الثقفی۔

"سب سے پہلے مقتول اس دن ابوطالبؑ کی اولاد میں علی اکبرؑ ہیں جو حسینؑ کے فرزند تھے اور آپ کی والدہ ام لیلیٰؑ تھیں جو ابومرہ ابن عروہ بن مسعود ثقفی کی بیٹی تھیں۔"

آپ نے جب حملہ کیا تو یہ رجز پڑھ رہے تھے۔

انا علیؑ بن حسین بن علی نحن ورب البیت اولیٰ بالنبیؐ

تاللہ لا یحکم فینا ابن الدعی

دیکھئے یہ رجز بھی تبلیغی رجز ہے۔ اس میں حمایتِ حق کے جذبہ کا اظہار ہے۔ "میں ہوں علیؑ، حسین بن علیؑ کا فرزند، ہم خانہ کعبہ کے پروردگار کی قسم نبیؐ کے سب سے زیادہ حقدار ہیں۔"

خدا کی قسم زنازادہ کی اولاد ہماری حاکم نہیں ہو سکتی۔[1]

امام حسینؑ کو یہ دکھلانا تھا کہ حمایتِ حق کے موقع پر سب سے زیادہ اپنے عزیز ترین شخص ہی کو فدا کرنا چاہیئے۔ سب سے زیادہ جو اپنے سے قریبی تعلق رکھتا تھا اس کو سب سے آگے بھیج دیا۔ وہی رسالت مآبؐ کا طرزِ عمل جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے کہ جب کا موقع ہوتا تھا۔ آپ اپنے خاص عزیزوں کو آگے رکھتے تھے چنانچہ عبیدہؓ جنگِ بدر میں شہید ہوئے اور حمزہؓ جنگِ اُحد میں۔ اسی طرح امیرالمومنینؑ نے جنگِ جمل میں علم لشکر اپنے فرزند محمدؐ بن حنفیہ کو دیا اور فوجِ دشمن پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اور اسی کا مکمل نمونہ امام حسینؑ نے کربلا میں پیش کیا کہ سب سے پہلے اپنے فرزند کو اجازت دے دی۔ جب وہ شہید ہو گئے تو پھر اور اعزا میدانِ جنگ میں گئے۔ طبری میں جناب علی اکبرؑ کے بعد سب سے زیادہ محبوب حضرت کو قاسمؑ ہی ہوں گے اسی لیے علی اکبرؑ کے بعد قاسمؑ کو میدان جنگ میں روانہ فرمایا۔

جناب عباسؑ، وہ امام حسینؑ کی اطاعت کے بڑے پابند تھے جو حسینؑ کی سیرت تھی وہ ہی جناب عباسؑ کی، میں نے جس طرح امامؑ کے متعلق عرض کیا تھا کہ امامؑ نے سب کو اپنے سامنے میدانِ جنگ میں بھیج دیا۔ تاکہ سب کی مصیبت آپ برداشت کریں۔ اس کے بعد اپنی جان دے دینا تو آسان ہے۔ وہی جناب عباس نے بھی کیا۔

---

[1] طبری، ج ۶ ص ۲۵۶۔

تین بھائی جناب عباسؑ کے حقیقی یعنی ام البنینؑ کے بطن سے تھے۔ عبداللہؑ جعفرؑ عثمانؑ، جناب عباسؑ نے ان سب کو اپنے پہلے میدانِ جنگ میں بھیجا اور کہا:

تقدموا بنفسی انتم فحاموا عن سیدکم حتی تموتوا دونہ۔

"میری جان تم پر سے فدا، تم آگے بڑھو اور اپنے سید و سردار (حسینؑ) کی حمایت کرو، یہاں تک کہ ان کے قدموں پر جان نثار کر دو۔"

وہ تینوں جوان آگے بڑھے اور حسینؑ کے سامنے کھڑے ہو کر دشمنوں کے حربے روکنے لگے اور جنگ کرنے لگے۔ یہاں تک کہ تینوں شہید ہو گئے۔[1]

جب عباسؑ نے اپنے بھائیوں کو امامؑ کے سامنے شہید ہوتے دیکھ لیا تب خود امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اذنِ جہاد طلب کیا۔ جناب عباسؑ یہ گوارا نہ کر سکتے تھے کہ دوسرے عزیز آپ سے پہلے میدانِ جنگ میں جا کر شہید ہو جائیں مگر آپ علمبردار تھے، آپ کو اپنی ذمہ داری کا احساس تھا۔ اور آپ سمجھتے تھے کہ علم فوج کا نشان ہے اور وہ جب تک قائم ہے اس وقت تک وقار و عزت کا قیام ہے۔ اس لیے اب تک سب مصائب برداشت کیے تھے۔ اور خود خاموش رہے تھے۔ مگر اب جب کہ سب شہید ہو گئے اور کوئی باقی نہ رہا تو اس وقت آپ کو حاضرِ خدمت ہونا پڑا اور عرض کیا: "اب مجھے بھی اجازت دیجئے" حسینؑ نے بھی اجازت دی۔ کہا کہ "تم علمدار ہو" مگر عباسؑ نے عرض کیا: "اب فوج کہاں ہے جس کا میں علمدار تھا۔" اب تو بس سردار ہے اور علمدار اور یہ ظاہر ہے کہ علمدار کی حیثیت کتنی ہی اہم ہو لیکن سردار کے برابر نہیں ہے۔

یہ اطمینانِ قلب کی دلیل ہے۔ وہ دیکھتے تھے کہ موقع کس بات کا ہے۔ جذبات کی رَو میں کوئی اقدام نہیں ہے۔ ہر ایک بات آئین کے مطابق، اصول کے موافق، کون پہلے جائے کس کے پہلے جانے میں کیا پہلو پیدا ہوتا ہے؟

---

[1] الاخبار الطوال صفحہ ۲۵۵۔

سلسلۂ شہدا میں سب سے پہلے اصحاب اور عزیزوں میں سب سے پہلے علی اکبرؑ اور آخر میں جناب عباسؑ اس کے بعد فوج کا خاتمہ ہوگیا۔ پھر جو قربانیاں ہوئی ہیں وہ بے بسی کی ہیں اس طرح امام حسینؑ نے میدانِ کربلا میں تعلیمی پہلو کو مدِّنظر رکھا۔

واقعۂ کربلا میں صرف مصائب ہی نہیں ہیں جو دلدوز ہونے کی حیثیت سے فطرتِ انسانی کو اشک افشانی کی دعوت دیتے ہیں بلکہ وہ اس کے ساتھ ساتھ مدرسۂ تربیت ہے جہاں دنیا کو اخلاق، ادب، فرائض شناسی کے اصول بتلائے گئے ہیں۔

مبارک ہیں وہ لوگ جو اس سے (جس طرح اس کے دلدوز پہلو سے اثر لیتے ہیں اسی طرح اس کی درسگاہی حیثیت سے) سبق حاصل کریں۔ اور اپنے تئیں عملی حیثیت سے ویسا ہی پیش کریں جیسا حسینؑ دنیا کو بنانا چاہتے تھے۔

قرآن فہمی کے لیے:
دورِ حاضر کی عظیم تفسیرِ قرآن
تفسیر نمونہ
کا مطالعہ ناگزیر ہے
اپنے قریبی بک سٹال سے رجوع فرمائیں
مصباح القرآن ٹرسٹ
۱۰۔ گنگارام بلڈنگ، شاہراہ قائدِ اعظمؒ۔ لاہور
ملنے کا پتہ
قرآن سنٹر
۲۴، الفضل مارکیٹ
اردو بازار، لاہور

مطبوعاتِ مصباح القرآن

کتاب	مصنف / مترجم			
قرآن پاک (معریٰ) رنگین		ہدیہ	۲۵۰	روپے
قرآن پاک (معریٰ) سفید کاغذ		ہدیہ	۵۰	روپے
قرآن پاک مترجم	از مولانا فرمان علیؒ	ہدیہ	۲۰۰	روپے
تفسیر نمونہ (۲۷ جلدیں)	ترجمہ مولانا سید صفدر حسین نجفیؒ	ہدیہ	۱۲۵	روپے (فی جلد)
قرآن کا دائمی منشور	" " " " "	ہدیہ	۱۲۵	روپے "
تفسیر پیام قرآن	" " " " "	ہدیہ	۱۲۵	روپے "
ہمارے آئمہؑ (۱۲ کتابوں کا سیٹ)	" " " " "	ہدیہ	۲۴۰	روپے (فی سیٹ)
ولایت فقیہ (جلد اوّل)	" " " " "	ہدیہ	۱۳۰	روپے
ولایت فقیہ (جلد دوم)	" " " " "	ہدیہ	۱۵۰	روپے
تفسیر فصل الخطاب (۷ جلدیں)	علامہ سید علی نقی النقویؒ	ہدیہ	۱۲۵	روپے (فی جلد)
تحریف قرآن کی حقیقت	" " " " "	ہدیہ	۲۵	روپے
صلح اور جنگ	" " " " "	ہدیہ	۱۰	روپے
مذہب اور عقل	" " " " "	ہدیہ	۲۰	روپے
رہنمایانِ اسلام	" " " " "	ہدیہ	۳۰	روپے
اُسوۂ حسینی	" " " " "	ہدیہ	۲۵	روپے
اثباتِ پردہ	" " " " "	ہدیہ	۲۰	روپے
معراج انسانیت	" " " " "	ہدیہ	۱۵	روپے
زندگی کا حکیمانہ تصوّر	" " " " "	ہدیہ	۲۵	روپے
آیت الکرسی	ترجمہ مولانا محمّد تقی نقوی	ہدیہ	۷۰	روپے
مدخل التفسیر	" " " " "	ہدیہ	۵۰	روپے
آیۂ تطہیر	" " " " "	ہدیہ	۳۰	روپے
توضیح المسائل	آقائے گلپائیگانی رحمۃ اللہ علیہ	ہدیہ	۶۵	روپے
مختصر الاحکام	" " " "	ہدیہ	۳۰	روپے
گفتارِ انبیاء	آقائے لنگرودی	ہدیہ	۴۰	روپے
معاد	آقائے محمّد تقی فلسفی	ہدیہ	۱۰۰	روپے

قرآن سنٹر ۲۴، الفضل مارکیٹ - اُردو بازار لاہور

فون: ۷۳۱۴۳۱۱